ریڈر شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی، بڑی تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۲۴۰، قیمت ۶ روپے

پتہ: ندوۃ المصنفین، اردو بازار، جامع مسجد دہلی نمبر ۶

عرصہ ہوا اس کتاب کا پہلا اڈیشن شائع ہوا تھا، اور اس پر معارف میں مفصل تبصرہ بھی ہوا تھا، اب دوسرا اڈیشن مزید اضافے کے بعد شائع کیا گیا ہے، پہلے اڈیشن میں چھبیس ۲۶ مکتوبات اور آٹھ ضمیمے تھے، اور دوسرا اڈیشن بیالیس ۴۲ مکتوبات اور گیارہ ضمیموں پر مشتمل ہے، ایک طویل خط کا عکس بھی دیا گیا ہے، اور ضمیمہ، مقدمہ اور تعلیقات میں بھی اضافے کیے گئے ہیں، ترتیب پہلے اڈیشن کے موافق ہے، یعنی پہلے مکتوبات کا فارسی متن، پھر اس کا سلیس شگفتہ اردو ترجمہ، اس کے بعد تعلیقات اور سب کے آخر میں ضمیمے ہیں، شروع کے مقدمہ میں مکاتیب پر مختلف حیثیتوں سے تبصرہ کیا گیا ہے، ان تمام مکتوبات سے شاہ صاحب کی بالغ نظری، ذہنی بیداری اور سیاسی شعور کے علاوہ اس عہد کی تاریخ سے متعلق بھی مفید معلومات حاصل ہوتے ہیں، اور وہ ادبی و دینی حیثیت سے بھی بصیرت افروز ہیں۔

آئینۂ جمال - مرتبہ جناب جمال بھارتی صاحب، تقطیع خورد، کاغذ معمولی، کتابت وطباعت قدرے بہتر، صفحات ۲۰۰ مجلد مع گرد پوش، قیمت ۵ر، پتہ کتبخانہ انجمن ترقی اردو، جامع مسجد دہلی ۶

جناب جمال بھارتی قوم پرور شاعر ہیں، یہ ان کا پہلا مجموعہ ہے، جو نظموں، غزلوں اور قطعات پر مشتمل ہے، مصنف کی قوم پروری اور حب الوطنی کی جھلک انکی شاعری کی تمام اصناف میں موجود ہے، اور انکی نظموں میں بڑا تنوع اور رنگا رنگی ہے، قومی، سیاسی اور رومانی نظموں کے علاوہ انھوں نے مختلف ارباب علم وسیاست کو خراج عقیدت بھی پیش کیا ہے، انکی بعض رومانی نظموں پر اختر شیرانی کی نظموں کا دھوکا ہوتا ہے، غزلوں میں حسن و عشق کے واردات اور زندگی کے تجربات و مشاہدات دونوں شامل ہیں، مصنف کو صحافتی مشغولیتوں سے زیادہ واسطہ رہا ہے، اس لیے ان کے کلام میں گہرائی و گیرائی اور زبان و بیان میں شان و شکوہ کی کمی ہے، لیکن ان کا تغزل سوز و اثر سے خالی نہیں ہے۔

"ض"

جلد ۱۰۶ - جمادی الثانی سنہ ۱۳۹۰ھ مطابق ماہ اگست سنہ ۱۹۷۰ء عدد ۲

مضامین

شذرات	شاہ معین الدین احمد ندوی	۸۲-۸۴

مقالات

بانی درس نظامی ملا نظام الدین فرنگی محلی	جناب مفتی محمد رضا صاحب انصاری فرنگی محلی استاذ شعبۂ دینیات، مسلم یونیورسٹی علی گڈھ	۸۵-۱۰۹
دربار اکبری کا ایک غیر معروف شاعر ثنائی	جناب ڈاکٹر نذیر احمد صاحب صدیقی	۱۱۰-۱۲۰
جدید عربی زبان پر ترکی کے اثرات	مترجمہ حافظ محمد نعیم ندوی، صدیقی رفیق دار المصنفین	۱۲۱-۱۳۵
شاہ حسین لاہوری کا ایک غیر معروف رسالہ تہنیتہ	جناب محمد اقبال صاحب مجددی لاہور	۱۳۶-۱۴۳
آداب الرسائل کا تنقیدی مطالعہ	جناب ڈاکٹر احتشام احمد صاحب ندوی لکچرر شعبۂ عربی و ڈگیشور یونیورسٹی آندھرا، پردیش	۱۴۴-۱۴۸

ادبیات

تضمین بر کلام اقبال	جناب منشاء الرحمٰن صاحب منشا	۱۴۹-۱۵۰
غزل	جناب قمر سنبھلی - دہلی	۱۵۰-۱۵۱
"	جناب عزیز احمد عزیز، بنارسی	۱۵۱
"	جناب محسن رضا، جونپوری	۱۵۲

باب التقریظ والانتقاد

نزہۃ الخواطر و بہجۃ المسامع والنواظر	"و م"	۱۵۳-۱۵۴
مطبوعات جدیدہ	"ض"	۱۵۵-۱۶۰

پاکستان کے خریداران معارف کیلئے ضروری اعلان

پاکستان میں معارف کے خریدار معارف کا چندہ اب حسب ذیل پتہ پر جمع کیا کریں:-

"جناب سید محمد نسیم صاحب - ۱۶ بی فرسٹ فلور - اسٹیڈیم - ڈھاکہ،"

نوٹ:- منی آرڈر میں پتہ انگریزی میں لکھیں،

"مینیجر"

شذرات

مسلم یونیورسٹی کی گولڈن جوبلی کے مسئلہ میں دو فریق ہو گئے ہیں، اسکے ارباب حل و عقد دسمبر میں جوبلی کرنا چاہتے ہیں، لیکن اولڈ بوائز کا ایک طبقہ ان حالات میں جبکہ یونیورسٹی کا دستور معطل ہے، اس کی آزادی سلب ہو گئی ہے، اس کا نظم ونسق حکومت کے نامزد کردہ ممبروں اور عہدہ داروں کے ہاتھ میں ہے اور یہ بھی نہیں معلوم کہ آئندہ جوبلی پیش ہونے والا ہے اسمیں یونیورسٹی کی کیا شکل ہو گی، اور اس کا کردار کہاں تک باقی رہے گا، جوبلی منانا بے موقع ہے، ان دونوں کا جذبہ اخلاص اور یونیورسٹی سے تعلق ہی پر مبنی ہے، اسلئے کسی فریق کی نیت پر شبہ کرنا صحیح نہیں ہے، مناسب صورت تو یہی تھی کہ جب تک یونیورسٹی ایکٹ نہ بنجاتا، اور اس کی واضح شکل سامنے نہ آجاتی اس وقت تک کیلئے جوبلی ملتوی کر دیجاتی تاکہ سارے مسلمان دلی مسرت کے ساتھ شریک ہوتے، اس میں کوئی قباحت نہیں تھی، جوبلی سے جو فوائد اس وقت حاصل ہونگے، وہی بعد میں بھی ہوتے، لیکن اب جبکہ جوبلی کے انتظامات شروع ہو گئے ہیں، اس کی مخالفت مناسب نہیں ہے،

مسلم یونیورسٹی ہندوستان کے مسلمانوں کی بڑی عزیز متاع، ان کی تقریباً ایک صدی کی محنت کا سرمایہ ان کے دل و دماغ کا سرچشمہ اور ان کی تہذیب و ثقافت کا مرکز ہے، اس سے ان کو جو جذباتی لگاؤ ہے وہ اسکی ادنیٰ شکست پر بیقرار ہو جاتے ہیں اسلئے اسکی یہ حیثیت قائم رہنی چاہئے، جس کا ہم بارہا اظہار کر چکے ہیں لیکن اسی کے ساتھ یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھنی چاہئے، کہ اب یونیورسٹی کے مصارف جسکی مقدار دو کروڑ سالانہ ہے حکومت برداشت کرتی ہے، اسلئے اگر وہ اسکو اپنی مرضی کے مطابق چلاتی ہے، تو مسلمان کس منہ سے اعتراض کر سکتے ہیں، اگر وہ اس کا نصف حصہ بھی فراہم کر سکتے، یا ان میں اپنے مطالبات منوانے کی طاقت ہوتی، اسوقت البتہ وہ حکومت سے جرأت کے ساتھ بات کر سکتے تھے، لیکن جب یہ دونوں صورتیں

نہیں ہیں تو اب یونیورسٹی کا معاملہ حکومت کے رحم وکرم پر ہے،

اگر یہ معاملہ مسز اندرا گاندھی یا ان کے جیسے سیکولر ذہن کے لوگوں کے اختیار میں ہوتا، تو امید تھی کہ وہ مسلمانوں کے جذبات کا لحاظ رکھیں گے، لیکن قانون بنانا پارلیمنٹ کے اختیار میں ہے، اس کے ممبروں کی خاص تعداد جن میں کانگریسی ممبر بھی ہیں یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کو پسند نہیں کرتی، اور فرقہ پرور پارٹیوں کے ممبر تو اس کے کھلے ہوئے دشمن ہیں، حکومت کے باہر بھی مختلف تدبیروں سے یونیورسٹی کے کردار کو ختم کرنیکی کوشش جاری ہے، مسلمان وزراء میں اتنی ہمت نہیں کہ وہ کھل کر مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی کر سکیں، اس لئے حکومت کی راہ میں بھی دقتیں ہیں، لیکن اسی کے ساتھ یہ مسئلہ اسکی سیکولرزم کا امتحان بھی ہے، اور بیرونی سیاسی مصالح کا تقاضا بھی، اس سے وہ مسلمانوں کے زخموں پر مرہم رکھ سکتی ہے، اس لئے توقع بھی ہے، کہ جو ایکٹ بنے گا، اس میں یونیورسٹی کی آزادی اور مسلمانوں کی اکثریت باقی رہے گی، اور اس کا نظام انہی کے ہاتھوں میں رہے گا، لیکن وہ بہرحال پرانے یونیورسٹی ایکٹ سے مختلف ہو گا، اور اس کی انتظامی مجالس اور کلیدی عہدوں پر حکومت کے نامزد کردہ ممبروں اور ایسے سیکولر مسلمانوں کے آنے کی پوری گنجائش بلکہ سہولت ہو گی، جن کو اسلامی کردار سے کوئی دلچسپی نہ ہو گی، بلکہ وہ اس کو سیکولرزم کے خلاف تصور کریں گے، اس لئے جو کچھ خطرہ ہے وہ اسی قسم کے مسلمانوں سے ہے، پہلے بھی انہی سے یونیورسٹی کو نقصان پہنچا ہے، اور آئندہ بھی انہی سے اندیشہ ہے، ان حالات میں یونیورسٹی کے اسلامی کردار کو قائم رکھنے کی ذمہ داری سب سے زیادہ خود اس کے ارباب حل و عقد اور اساتذہ اور طلبہ پر عائد ہوتی ہے، اگر وہ اس کا نمونہ بن جائیں تو پھر کوئی طاقت اسکو نہیں مٹا سکتی اس کے کردار کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اسمیں مسلمانوں کی اکثریت رہے، مگر اس کا نظام ان مسلمانوں کے ہاتھوں میں رہے، جن کو اسلام سے کوئی تعلق نہ ہو، اور وہ ان کے حصول جاہ و مال کا ذریعہ بنی رہے، بلکہ یہ معنی ہیں کہ یونیورسٹی کی فضا اسلامی رہے، اسلامی شعائر کا پورا احترام کیا جائے، اس کے خلاف کوئی بات یونیورسٹی کے حلقہ میں نہ ہونے پائے، اس کو دارالعلوم دیوبند یا ندوہ نہ بنایا جائے، لیکن کارل مارکس اور لینن کی پرستش گاہ بھی نہ بننے پائے، ہم سے مسلم یونیورسٹی کی تو وہ فضا ہونی چاہئے جس کا مظاہرہ اسلامی ملکوں کے سربراہوں کی آمد کے موقع پر کیا جاتا ہے،

اسکا اعتراف ہے کہ ایک محدود حلقہ کو چھوڑ کر یونیورسٹی کے طلبہ اور اساتذہ کی اکثریت میں اسلامی حمیت اور ایک طبقہ میں خاصی دینداری موجود ہے، اور کسی شخص میں یہ ہمت نہیں ہے کہ وہ علانیہ غیر اسلامی

خیالات کا اظہار یا تبلیغ کرسکے، ورنہ اب تو ان اداروں تک کا جن کا سنگ بنیاد بڑی مقدس ہستیوں نے رکھ…
اور جن کا مقصد قوم پرور لیکن سچے مسلمان پیدا کرنا تھا، یہ حال ہے، کہ اس کے ذمہ دار تک علانیہ اسلام…
نیش زنی کرتے اور مسلمانوں کے لئے دلخراش باتیں لکھتے رہتے ہیں، اسکے مقابلہ میں مسلم یونیورسٹی بہت غنیمت…
مسلمانوں کی غیر سیاسی تنظیمیں بھی ایک طبقہ کی نگاہ میں کھٹکتی ہیں اور ان پر بے تکلف فرقہ پروری کا…
لگا دیا جاتا ہے، جس سے جمعیۃ العلماء بھی مستثنیٰ نہیں ہے، جماعت اسلامی خاص طور سے اس کا نشانہ ہے، اور جب…
حکومت اور ملک کے سنجیدہ طبقہ نے کھل کر فرقہ پرور جماعتوں کی مخالفت شروع کی ہے، یہ لے اور تیز ہو گئی ہے…
ترازو کے دونوں پلڑے برابر کرنے کے لئے ان کے ساتھ جماعت اسلامی کو بھی شامل کر لیا گیا ہے جس کا…
سے کوئی تعلق نہیں، جماعت اسلامی خالص دینی جماعت ہے اس نے سیاست میں کبھی حصہ نہیں لیا، بلکہ سیاست میں…
لینا اسکے اصول کے خلاف ہے، اس نے کسی فرقہ کی مخالفت کی نہ کسی کے خلاف جارحانہ اقدام کیا، نہ…
فتنہ وفساد برپا کیا، بلکہ اسکو ہمیشہ فرو کرنے کی کوشش کی، اس کا مقصد اور کام بالکل کھلا ہوا ہے، اس کا…
مقصد مسلمانوں کو صحیح معنوں میں دیندار بنانا، اور دوسرے مذاہب والوں کو خدا کے احکام اور ان کے…
کی اخلاقی تعلیمات پر عمل کی دعوت دینا ہے، وہ سارے فرقوں سے کہتی ہے "تعالوا الیٰ کلمۃ سواء بیننا و…
بینکم"، چنانچہ وہ اپنے عام اجتماعوں میں ہندوؤں کو بھی شرکت کی دعوت دیتی ہے، اور وہ ان میں شریک…
بھی ہوتے ہیں، اس لئے اس کی دعوت تو دین کی مشترک تعلیمات پر اتحاد کی دعوت ہے…
نہ کہ اختلاف اور فرقہ پروری کی، اس لئے حکومت کو اس کی حوصلہ افزائی کرنی چاہئے…
کہ جو کام وہ سیکولرزم کی وجہ سے انجام نہیں دے سکتی، وہ جماعت اسلامی انجام…
دے رہی ہے، اس کی دعوت بالکل کھلی ہوئی ہے، اس کا لٹریچر چھپا ہوا موجود ہے…
ان کے مقررین عام مجمعوں میں تقریریں کرتے ہیں، اگر حکومت جماعت اسلامی…
کو حقیقۃً فرقہ پرست جماعت سمجھتی ہے، تو ان چیزوں سے اس کا ثبوت فراہم کرنا چاہئے…
ورنہ محض شعر کا وزن برابر کرنے کے لئے جماعت اسلامی کو فرقہ پرور قرار دینا…
بڑی زیادتی ہے،

مقالات

بانی درس نظامی ملا نظام الدین محمد فرنگی محلی

از جناب مفتی محمد رضا انصاری صاحب فرنگی محلی استاد شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(۲)

ظاہری حالات پر نظر ڈالیے تو وہ یہ تھے کہ ملا قطب الدین شہید سہالوی کا یہ یتیم جو باپ کی شہادت کے وقت چودہ سال کا تھا، عالمگیری فرمان کے بموجب جو حادثۂ شہادت کے پورے دو سال کے بعد یعنی ۱۱۰۵ھ میں باضابطہ جاری ہوا، "یک منزل حویلی فرنگی با متعلقہ آن واقع بلدۂ لکھنؤ مضافات بصوبۂ اودھ" کی ایسی وسیع عمارت میں اپنی دادی، والدہ، دو بھاوجوں، تین خورد سال بھتیجوں اور ایک چھوٹے بھائی کے ساتھ رہ رہا ہے، اب خود اس کی عمر سولہ سال کی ہوچکی ہے، حویلی کے فرمان کے ساتھ کچھ مدد معاش بھی بادشاہ وقت کی طرف سے مقرر ہے، ہر طرح فراغت کا دور ہے، عنفوان شباب ہے دوچار قطبی خاندان کا یہ یتیم دونوں بڑے بھائیوں کی نگرانی اور تربیت کے دباؤ سے بھی آزاد ہے، وہ دونوں اس سے، اور گھر بار سے بہت دور اورنگ زیب عالمگیر کی سپرد کردہ علمی اور انتظامی خدمتوں پر مامور ہوکر وطن کی خبروں سے اور اہل وطن ان کی خبروں سے لاعلم ہو چکے ہیں، یہ بھی پتہ نہیں چل سکا کہ ان دونوں بڑے بھائیوں کی کب اور کہاں وفات ہوئی، ان حالات کا تقاضا یہی ہے کہ

وہ رئیس زادے کی سی زندگی گزار کر اپنے خاندان کا نام ڈبو دے، لیکن جو ہوا وہ ظاہری تقاضوں کے بالکل برعکس ہوا، ماں، دادی اور شفیق بھاوج جن کے سایۂ عاطفت کو اس نے خیرباد کہا تھا، ان کے بڑے ہونے کی ذمہ داری کی پروا نہ کی، گھر میں پڑھائی کا بندوبست ممکن نہ پا کر اس نے ترک وطن کا عزم کر لیا، مگر یہ ترک وطن آبائی وطن سہالی چھوڑنے سے مختلف انداز کا تھا، وہ مجبور ہو کر چھوڑا تھا، یہ پورے اختیار کے ساتھ۔

تذکرہ نویس لکھتے ہیں اور بجا لکھتے ہیں کہ ملا قطب الدین شہید کے کنبے کے لکھنؤ منتقل ہونے اور حویلی فرنگی میں اطمینان کے ساتھ آباد ہونے میں کم و بیش دو سال کا عرصہ لگا، اور جب مستقر اور قیام گاہ کی طرف سے پورا اطمینان ہو گیا تو نظام الدین محمد بن ملا قطب الدین شہید سولہ[۱۶] سال کی عمر میں بغرض حصول تعلیم گھر سے نکلے، اور کم و بیش دس سال میں تعلیم مکمل کر کے وطن واپس لوٹے، (مجھے مدت تحصیل تعلیم کی اس تخمین سے اختلاف ہے، وجوہ آگے بیان ہوں گے)

اساتذہ | اساتذہ میں سب سے پہلے خود والد ماجد ملا قطب الدین تھے، جن کی حیات میں شرح ملا جامی تک ان کی تعلیم ہو چکی تھی، گو پوری قطعیت کے ساتھ، سند اور ثبوت کے بغیر یہ کہنا ممکن نہیں کہ ملا شہید کی حیات میں جس قدر تعلیم ہوئی وہ سب ان ہی سے حاصل کی لیکن قرین قیاس یہی ہے کہ فاضل اور معلم باپ نے ہونہار فرزند کی تعلیم کی طرف بذات خود توجہ کی ہو ___ والد ماجد کی شہادت کے بعد دیوہ (ضلع بارہ بنکی) جائس (ضلع رائے بریلی) بنارس اور لکھنؤ میں تعلیم حاصل کرنے کی روایتیں ملتی ہیں، لیکن دیوہ میں پڑھانے والے کا نام کہیں نہیں ملتا، دوسرے اساتذہ کے نام پوری صراحت کے ساتھ، تاریخ نے محفوظ کر لیے ہیں، لکھنؤ سے قریب ہی قصبہ جائس ضلع رائے بریلی میں والد ماجد کے ایک صاحب درس شاگرد ملا علی قلی جائسی کے درس کی شہرت تھی، اس قصبے میں ملا محمد باقر بھی مسند درس بچھائے ہوئے تھے، قطب شہید کا یہ فرزند پہلے ملا باقر ہی کی خدمت میں حاضر ہوا

جنہوں نے اسے ہدایت کی کہ وہ ان کے بعض تلامذہ سے پڑھنا شروع کرے، عام رواج کے لحاظ سے یہ کوئی نامناسب بات نہ تھی، لیکن نظام الدین محمد نے جن کی قسمت میں درس و تدریس کی بادشاہی لکھی تھی، "تودۂ کلاں" ہی سے استفادہ پسند خاطر رکھتے ہوئے اس صورت حال کو قبول نہیں کیا، اور ملا علی قلی جائسی کے پاس حاضری دی اور ان ہی سے اکثر کتب درسیہ پڑھیں، اس کے بعد بنارس جا کر والد ماجد کے ایک دوسرے صاحب درس اور صاحب تصانیف مفیدہ شاگرد ملا امان اللہ بنارسی سے "شرح مواقف" جو علم کلام کی انتہائی کتاب ہے پڑھی، لکھنؤ واپس آکر ملا غلام نقشبند سے جو شاہ پیر محمد صاحبؒ کے مزار پر (واقع کنارۂ دریائے گومتی) فرائض درس اور فریضۂ رشد و ہدایت انجام دے رہے تھے، اور بیک واسطہ شاہ پیر محمد صاحبؒ کے خلیفہ اور سجادہ نشین تھے، فن ہیئت کی آخری کتاب "رسالہ قوشجیہ" پڑھی اور فارغ التحصیل ہو کر "ملا نظام الدین محمد بن ملا قطب الدین شہید" ہو گئے، علامہ سید عبدالحئی الحسنی جو تراجم کے سلسلے میں صاحب ترجمہ کی حقیقی خصوصیتوں کی نشاندہی میں ید طولیٰ رکھتے ہیں، ملا نظام الدین کو الامام العالم الکبیر، العلامۃ الشہیر، صاحب العلوم والفنون غیث الافادۃ الهتون خذ العالم بالربع المسکون، استاذ الاساتذۃ امام الجہابذۃ الذی تفرد بعلومہ ا لواہا بیدہ لم یکن لہ نظیر فی زمانہ فی الاصول والمنطق والکلام (نزھۃ الخواطر) کے شاندار القاب و فضائل سے نذرانۂ عقیدت پیش کرتے نظر آتے ہیں۔

فرنگی محل | "حویلی فرنگی" کہئے یا فرنگی محل، اس کے در و دیوار جو "فرنگی" تاجر کے دوران قیام میں بیوپار کی صداؤں سے مانوس رہ چکے تھے، اب پہلی بار فارغ التحصیل ملا نظام الدین محمد کی مسند درس اپنے حدود میں بھی دیکھتے ہیں، یہ کم و بیش ۱۱۱۵ھ / ۱۷۰۳ء ہے، اور تھوڑے ہی عرصہ میں ملا نظام الدین نے اپنی شاندار علمی اور تدریسی خدمتوں سے اس "حویلی فرنگی" کو علامہ سید سلیمان ندوی

کے الفاظ میں "ہندوستان کا سب سے بڑا دارالعلوم" بنا دیا، اور علمی تاریخ میں اس حویلی کو زندۂ جاوید نام بخش دیا۔

"فرنگی محل" کا نام پڑھنے اور سننے والے بجا طور پر سوچ میں پڑ جاتے ہیں کہ فرنگی محل کے نام اور اس کے کام میں وجہ مناسبت کیا ہوسکتی ہے، خوش عقیدگی، قیاس کی مدد لیکر اسکو "فرہنگی محل" کی بگڑی ہوئی شکل قرار دے چکی ہے، "فرہنگ" بمعنی علم و دانش۔ اس کے خیال میں کثرت استعمال سے "فرنگ" ہوگیا ہے۔[1]

[1] قبل اسکے کہ نام کی اصلیت کی جستجو تاریخ کے صفحات پر کیجائے، اس سلسلے کے ایک لطیفہ کا ذکر نا ظلم ہوگا،

۴۴-۴۵ سال پہلے کی بات ہے، فرنگی محل میں مسلم اکاڈمی کا جلسہ تھا، یہ وہ علمی اور ادبی انجمن تھی جس کو مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی اڈیٹر دلگداز اور شہر کے ممتاز علما اور ادبا نے باہمی تعاون سے غالباً ۱۹۲۵ء میں قائم کیا تھا، عموماً ہر مہینے اسکی ایک نشست کسی ایک ممبر اکاڈمی کے یہاں ہوتی تھی جس میں کوئی عالم یا اہل قلم علمی، ادبی یا تاریخی مقالہ پڑھتا تھا جس پر تبادلۂ خیال ہوتا تھا، اسکے بعد میزبان ممبر کی طرف سے شرکائے جلسہ کی ضیافت کی جاتی تھی، جو شروع شروع تو عام ضیافت رہی، اسکے بعد باقاعدہ پر تکلف دعوتیں ہونے لگیں جن میں ممبروں کے علاوہ معززین شہر مدعو ہونے لگے، اسی قسم کی پرتکلف دعوت والا ایک جلسہ فرنگی محل میں ہوا جس میں علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم نے "رباعی" پر مقالہ پڑھا تھا، مقالہ کے بعد تمام مہمان دسترخوان پر یکجا ہوئے، میزبان جدی و استاذی مولانا محمد عنایت اللہ فرنگی محلی تھے، راقم الحروف گھر کے بچوں کے ساتھ کھانا کھلانے کی خدمت انجام دے رہا تھا، ڈاکٹر محمد وحید مرزا (سابق صدر شعبۂ عربی لکھنؤ یونیورسٹی) نے یا کسی اور صاحب نے مولانا عنایت اللہ صاحب سے پوچھا کہ فرنگی محل کی وجہ تسمیہ کیا ہے؟ قبل اسکے کہ مولانا مرحوم کچھ کہیں مسٹر محمد وسیم بیرسٹر ایٹ لا نے (جو حکومت پاکستان کے ایڈوکیٹ جنرل ہوکر ۱۹۵۰ء میں وفات پاگئے) اس بے تکلفی کے حق سے جو ان کو مولانا مرحوم اور دوسرے علمائے فرنگی محل سے تھی، کہا "وجہ تسمیہ بس یہی ہے کہ یہاں کے کسی عالم نے ایک فرنگن سے نکاح کر لیا تھا، اسی لیے فرنگی محل ہوگیا"، لکھنؤ کے مشہور معالج ڈاکٹر عبدالحمید نے جو پاس ہی بیٹھے تھے، برجستہ کہا "جی ہاں! جس طرح اب ڈالی باغ "فرنگی محل" ہوگیا ہے"، اس پر ایک زوردار قہقہہ پڑا جس میں وسیم صاحب بھی پوری طرح شریک ہوئے، اسی زمانہ میں ڈالی باغ میں (جو وسیم صاحب مرحوم کی عالیشان رہائشی کوٹھی تھی) رہنے والے ایک نوجوان لندن سے بیرسٹری کرکے آئے تھے، اور انکی منکوحہ انگریز خاتون بھی ان کے ہمراہ آئی تھیں اور وہیں وہ بھی رہتی تھیں۔
(محمد رضا انصاری)

علمی تاریخ کے علاوہ مولانا قیام الدین محمد عبدالباری فرنگی محلیؒ (وفات ۱۹۲۶ء) کی رہنمائی میں جب فرنگی محل ملکی اور ملی سیاست کا ایک بڑا مرکز بن گیا اور سیاسی تاریخ میں بھی اس کا نام بار بار آنے لگا تو اس بنا پر کہ فرنگی محل سیاست کا بنیادی خیال فرنگیوں کی مخالفت تھا اور خلافت تحریک (جس کو لوگ مخالفت کا مرادف سمجھتے تھے) بڑی حد تک مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی ذات سے وابستہ تھی، فرنگی محل کے نام کی عجیب عجیب توجیہیں کیجانے لگیں، ان سب کا مفہوم مشترک یہ تھا کہ یہ "محل" فرنگیوں کی مخالفت کا مرکز اور مقام ہے،

بہرحال اس مرکز علمی کے نام میں "فرنگی" کا جز ایک سوال بن کر خاص و عام کے ذہن میں عجیب و غریب گل کھلاتا رہا، اس صورت حال سے لسان العصر اکبر الہ آبادی کی ذہانت نے بھی خوب فائدہ اٹھایا، جب دارالعلوم ندوۃ العلماء کی نئی عمارت کا سنگ بنیاد یوپی کے گورنر سر جان سکاٹ ہیوٹ نے رکھا تو انھوں نے جس طرح طبع آزمائی کی اس کو علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم کے الفاظ میں سنیئے:-

"عجب حسن اتفاق ہے، ہندوستان کا سب سے بڑا دارالعلوم لکھنؤ کا "فرنگی محل" تھا، جو درس نظامی کا بانی ہے، اور جس کے دامن فیض سے مولانا بحرالعلوم، ملا حمد اللہ، ملا حسن وغیرہ تعلیم پاکر نکلے، یہ "فرنگی محل" اس لیے کہلاتا تھا کہ ایک فرنگی کی کوٹھی تھی، اور اس لیے "محل" اسکی طرف منسوب ہوگیا، شاہ عالمگیر کی سند میں یہ نام درج ہے، اس جدید دارالعلوم (ندوۃ العلماء) کی بنیاد ہز آنر لفٹننٹ گورنر نے رکھی کہ وہ بھی اہل فرنگ ہیں، میر اکبر حسین صاحب اکبر الہ آبادی نے اس موقع پر اس حسن اتفاق سے شاعرانہ کام لیا، لکھتے ہیں:-

رکھی بنائے ندوہ ہز آنر نے آکے خود
سچ پوچھئے اگر تو "فرنگی محل" ہے یہ"

(حیات شبلی ص ۴۴۸)

شعر و شاعری میں 'فرنگی محل' کی نمود مختلف اندازوں میں ہوئی، قدیم لکھنؤ سے واقفیت نہ رکھنے والے چکر میں پڑ گئے کہ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟ جب انھوں نے آتش کا یہ مطلع پڑھا،

ڈھلتی ہے عاشقانہ ہماری غزل تمام — چھانے ہوئے ہیں کوئے فرنگی محل تمام

تاریخ ادب میں "کوئے فرنگی محل" کی تلمیح کی کوئی تشریح نہ پاکر قدیم و جدید ادب کے رمز شناس محترم مولانا عبد الماجد دریابادی سے اس سلسلے میں کئی سال قبل رجوع کیا تھا، مولانا نے دوسرے استفسارات کے جواب کے ساتھ یہ تحریر فرمایا تھا،

"فرنگی محل" پہلے چوک سے ممیز نہ تھا، اس کی شہرت وہی تھی جو بعد کو چوک کی ہوئی، "قلق" کا بھی مشہور مصرع ہے ع "جب دیکھئے قلق کو فرنگی محل میں ہے۔"

خدا جزائے خیر دے ریختی گو شاعر جان صاحب کو (جن کا پورا نام میر یار علی ہے) ان بچارے کی وجہ سے شاعری میں 'فرنگی محل' کی آبرو بنی رہی، وہ اپنے مخصوص انداز میں (۱۲۸۱ھ مطابق ۱۸۶۴ء میں) کہتے ہیں :-

۱۔ فرنگی محل، گوری بی صاحبہ! — ہے دنیا میں جنت کا تختہ اجی

۲۔ سلامت خدا رکھے اس باغ کو — اس باغ کے گل ہیں سب جنتی

۳۔ جو باغی ہیں ان کے رہیں خار خار — یہاں کے نہ غنچے کہ ہو بے کلی

۴۔ بڑے چھوٹے سب دین کے رہنما — یہ ہادی ہیں مرشد ہیں کامل ولی

۵۔ قسم باجی! مریم کے سر کی مجھے — کہ جس شمع سے لو ہے میری لگی

۶۔ میں سو جان سے کیوں نہ پروانہ ہوں — رہے ان کے اقبال کی روشنی

۷۔ وہ میرے مسیحا ہیں گردوں جناب — عنایت مرے حال پہ ہے بڑی

۸۔ چلو جان صاحب مرے ساتھ تم — رہے گی وہاں دو گھڑی دل لگی

۹۔ عطا مجھ کو فرمائیں گے آبرو — ہیں ہر علم کے قدر داں جوہری

قدیم تاریخ سے بس اتنا پتہ چلتا ہے کہ فرنگی تاجر کی کوٹھی جو سرکاری املاک میں آ چکی تھی اورنگ زیب عالمگیر نے ملا قطب الدین شہید سہالوی کے خانماں برباد کنبے کو رہنے کے لیے دیدی، اس سلسلے میں شاہی فرمان جو نافذ ہوا تھا، وہ ہنوز محفوظ ہے، جس کی نقل یہ ہے :-

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم (طغرا) یا ایها الذین آمنوا اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم - مہر: ابو المظفر محمد محی الدین عالمگیر بادشاہ غازی (سع قب)

دریں وقت میمنت اقتران فرمان والا شان واجب الاذعان صادر شد کہ یک منزل حویلی فرنگی متعلقہ آں واقع بلدۂ لکھنؤ مضاف بصوبہ اودھ کہ از المنۂ نزولی است برائے بودن شیخ محمد و محمد سعید پسران ملا قطب الدین شہید حسب الضمن مقرر فرمودیم باید کہ حکام و عمال و متصدیان مہمات حال و استقبال و جاگیرداران و کروریان آں را بنام مشار الیہما معاف و مرفوع القلم دانستہ بوجہ من الوجوہ مزاحم و معترض نہ شوند و اندریں باب سند مجدد نہ طلبند۔

(مرقوم غرۂ ذیقعدہ سال سی و ہفتم جلوس والا نوشتہ شد)

فرمان کی پشت پر جو عبارت ہے، اس کا اقتباس یہ ہے :-

"شرح یادداشت واقع بتاریخ روز پنجشنبہ ۱۴ شعبان المعظم ۳۷ سنہ جلوس والا موافق ۱۱۰۵ھ مطابق مرداد ماہ برسالۂ صدارت و شیخت پناہ فضیلت و کمالات دستگاہ سزاوار مرحمت و احسان صدر رفیع القدر فاضل خاں و نوبت واقعہ نویسی کمترین بندگان درگاہ خلائق پناہ حسام الدین حسین قلمی می گردد کہ بعرض مقدس معلی رسد کہ شیخ محمد اسعد و محمد سعید پسران ملا قطب الدین شہید ساکن قصبۂ سہالی بسبب شہادت پدر خود قصبۂ مذکور را گذاشتہ جلاوطن گردیدند و کدام مکانہائے سکونت ندارند الخ"

بلاشبہ "حویلی فرنگی" ملا نظام الدین کے قیام اور نصف صدی تک سلسلۂ درس و تدریس

جاری رکھنے کے نتیجے میں علامہ شبلیؒ کے الفاظ میں "اسلامی علوم کی یونیورسٹی بن گئی"۔ لیکن فرمان میں فرنگی محل کے نام سے مدرسہ کے قیام کا کوئی ذکر نہیں ہے، اس عہد کی ایک فاضل اور لائق شخصیت یعنی مسٹر آصف بن علی اصغر فیضی نے اپنے ایک انگریزی مضمون میں جس کا اردو ترجمہ "ہندوستان میں مذہب اسلام پر نظر ثانی کی ضرورت" کے نام سے شائع ہو چکا ہے، لکھ دیا ہے:۔

"۱۱۰۵ھ (مطابق ۱۶۹۴ء) میں جبکہ وہ (ملا نظام الدین فرنگی محلی) پندرہ سال کے تھے اورنگزیب کے فرمان سے ایک مدرسہ "فرنگی محل" کے نام سے قائم ہوا اور کچھ زمین و مکانات ملا نظام الدین کے دو بڑے بھائیوں کے نام اس مدرسے کے لیے وقف کیے گئے، تکمیل تعلیم کے بعد ملا نظام الدین اس مدرسے میں معلم ہو گئے، اور اپنے والد ملا قطب الدین کے ساتھ "مددگار مدرس" رہے" (ص ۱۰ اردو ترجمہ)

فرنگی محل کے نام سے مدرسہ[1] قائم کرنے کی بات تو کسی مغالطے پر مبنی قرار دی جا سکتی ہے مگر ملا قطب الدین شہید

---

[1] عہد اورنگ زیب کا ایک غیر ملکی باشندہ ویر نیر تھا، جو دارا شکوہ سے قریبی تعلق رکھتا تھا، اس نے اپنے سفرنامے میں اورنگزیب کی سخت مذمت کی ہے۔ اس سفرنامے کے حوالے سے نرینڈر ناتھ لا نے اپنی کتاب "پروموشن آف لرننگ ان انڈیا ڈیورنگ محمڈن رول" میں لکھا ہے کہ اورنگ زیب نے ایک دفعہ ایک ڈچ باشندہ کی حویلی جو فرنگی محل میں تھی، ضبط کر لی اور ایک مسلمان کے حوالے کر دی "ایک مدرسہ قائم کرنے کیلئے"۔ یہی عبارت مسٹر اے اے فیضی کی غلط فہمی کا باعث بنی ہے، ضبط کرنے کے الزام کی تردید تو دوسرے ذرائع سے ہو سکتی ہے (یا نہیں ہو سکتی ہے، اس سے یہاں بحث نہیں ہے) لیکن مدرسہ بنانے کے لیے "فرنگی محل" دینے کی بات اس فرمان کی روشنی میں بے بنیاد ہو جاتی ہے، "برائے بود و باش" کے الفاظ بہت صاف ہیں یعنی رہائش کے لیے دی گئی تھی۔

خود برنیر نے اپنے سفرنامے میں لکھا ہے "ڈچ باشندے بہت بڑے پیمانے پر کپڑوں کی خریداری کا کام بھی کرتے تھے نہ صرف جلالا پور میں بلکہ لکھنؤ میں بھی" (ص ۲۹۲ ترجمہ انگریزی کا ہے)

(باقی حاشیہ ص ۹۳ پر)

کو اس مدرسہ کا صدر مدرس اور ملا نظام الدین کو مددگار مدرس قرار دینا تاریخی صراحتوں کے یکسر خلاف ہی نہیں بلکہ بالکل خلافِ واقعہ ہے۔ ملا نظام الدین کی تعلیم کی تکمیل سے دس سال قبل ہی ان کے والد ملا قطب الدین شہید ہو چکے تھے،

مولانا عبدالحلیم شررؔ لکھنوی نے اس سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے وہ بھی غیر ذمہ دارانہ ہے، "گزشتہ لکھنؤ" میں مولانا لکھتے ہیں:۔

"شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے کسی ضرورت سے اجودھیا کا سفر کیا، واپسی کے وقت لکھنؤ میں ٹھہرتا ہوا دہلی گیا .... اور غالباً اسی موقعہ پر اس نے فرنگی محل کے مکانات علامۂ زماں ملا نظام الدین کی نذر کیے ہوں گے"

فرنگی محل کے مکانات نذر کرنے کا "قیاس" شاہی فرمان کی موجودگی میں بالکل بے محل ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اورنگ زیب کے لکھنؤ آنے کا زمانہ اس کی حکومت کا ابتدائی زمانہ ہے تخت نشین ہونے کے ابتدائی ۲۲۔۲۳ سال تو اورنگ زیب نے ضرور شمالی ہندوستان میں گزارے،

(بقیہ حاشیہ ص ۹۲) اسی انگریزی عبارت پر ایک حاشیہ بھی ہے، جس میں کہا گیا ہے "فرنگی محل یا فرنیگ کے کوارٹر میں جو لکھنؤ شہر کا ایک قطعہ یا ایک وارڈ ہے، یہیں فیکٹری تھی، یہ عمارتیں اورنگزیب کے زمانے میں ضبط کر لی گئیں اور ایک مسلمان کو مدرسہ یا کالج بنانے کے لیے دے دی گئیں (انگریزی ترجمہ)

اس صراحت سے یہ ظاہر ہو گیا کہ "فرنگی محل" کا دوسرا نام "فرنیگس کوارٹرس" بھی تھا، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ نیل یا گھوڑوں کی تجارت کے بجائے جیسا کہ مشہور ہو گیا ہے، یہاں کپڑوں کی تجارت ہوتی تھی اور ایک کارخانہ بھی یہاں تھا، کپڑے ہی کا کارخانہ ہوگا، اس وقت کارخانے کا جو مفہوم ہو سکتا ہے وہی یہاں سمجھنا چاہیے۔

بہرحال لفظ "فرنگی محل" اس عمارت یا عمارتوں کا اصل نام تھا، یہ نہیں کہ بگڑ کر فرنگی محل ہوا ہو، جیسا کہ قیاس کیا جاتا رہا ہے۔

لیکن آخری ۲۵-۲۶ سال اس کے دکن میں صرف ہوئے اور ان آخری برسوں میں اس کے لکھنؤ آنے کی کوئی شہادت نہیں ملتی. فرمان شاہی پر تخت نشینی کے ۳۰ ویں سال کی تاریخ پڑی ہے۔ اس وقت یقیناً اورنگ زیب دکن میں تھا۔

فرنگی محل کے مکانات نذر کرنے کے سلسلے میں ملا نظام الدین کا نام لینا بھی صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ ملا نظام الدین شاہی فرمان کے صدور کے وقت سولہ سالہ ایک یتیم تھے، فرمان میں ان کے دونوں بڑے بھائیوں کے صرف نام ہیں، ملا نظام الدین اور ان سے بھی چھوٹے بھائی ملا محمد رضا کے نام نہیں ہیں،

بے شک ملا نظام الدین کی مسند درس بچھنے کے بعد ملا صاحب کی علمی خدمتوں نے مولانا شرر کے الفاظ میں :-

"چند ہی روز میں فرنگی محل کو ہندوستان کی ایک ایسی اعلیٰ یونیورسٹی بنا دیا کہ سارے ہندوستان کے علماء اور فضلاء کا مرکز لکھنؤ کا یہی چھوٹا سا محلہ قرار پایا........ ان دنوں لکھنؤ ایک گمنام شہر تھا، مگر ایسے ایک گمنام مقام کا اتنی بڑی یونیورسٹی بن جانا کہ ہندوستان تو درکنار، بخارا، خوارزم اور ہرات و کابل اس کے آگے سر جھکانے میں بہت ہی حیرت کے قابل ہے، ساری اسلامی دنیا ہمیں کی شاگردی پر فخر کر رہی تھی۔" (گزشتہ لکھنؤ)

جب ملا نظام الدین نے کم و بیش ۱۱۱۵ھ (مطابق ۱۷۰۳ء) میں فارغ التحصیل ہونے کے بعد آبائی مشغلہ درس و تدریس؟ اختیار کیا، اس وقت لکھنؤ واقعی ایک قصبہ تھا، اورنگزیب کا عہد ختم ہو رہا تھا، اور صوبہ اودھ جس کی طرف لکھنؤ مضاف (منسوب) تھا کسی خصوصی حیثیت کا مالک نہیں تھا، برہان الملک کی نوابی بھی قائم ہونے میں ابھی دیر تھی، عدلیہ، انتظامیہ اور بلدیہ کے حکام کا براہ راست مغل شہنشاہ کے دربار سے تقرر ہوتا تھا۔ شیخ زادوں کی سرکش حکمرانی

کے دور سے لکھنؤ اس وقت گزر رہا تھا۔ "حویلی فرنگی" یا فرنگی محل کا درجہ ملا قطب الدین شہید کے کنبے کی رہائش گاہ اور قصبہ لکھنؤ کے عام محلے سے بلند ہو کر ملا نظام الدین کی درسگاہ یا مدرسہ ملا حسن تک جب پہنچا تو اٹھارہویں صدی عیسوی کا عین آغاز تھا، مغل خاندان کا آخری مطلق العنان شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر دکن میں اپنی عمر کے آخری چار سال گذار رہا تھا، وہ ۱۱۱۸ھ (مطابق ۱۷۰۷ء) میں اپنی عظیم سلطنت کو کمزور ہاتھوں کے لیے چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہو گیا، شاہ عالم (محمد معظم شاہ) تخت نشین ہوا، وہ بھی چار سال حکومت کر کے (۱۱۲۳ھ مطابق ۱۷۱۲ء میں) دنیا سے رخصت ہوا، مہینہ پندرہ دن کے لیے تخت پر بیٹھنے والے کئی "مغل شہنشاہوں" سے قطع نظر فرخ سیر کے چھ سالہ دور حکومت (۱۷۱۳ء سے ۱۷۱۹ء تک) اور محمد شاہ کے تیس سالہ دور حکومت (۱۷۱۹ء سے ۱۷۴۸ء تک) کو ملا نظام الدین فرنگی محلی کے مسند درس کی آبیاری سے نمو نصیب ہو گیا،

سلطنت مغلیہ کے وارث شہنشاہ ہندوستان محمد شاہ اور سلطنت علمیہ کے اورنگ نشین اور کئی پشتوں کے خاندانی علم و فضل کے وارث استاذ الہند ملا نظام الدین محمد فرنگی محلی کا وصال ایک ہی سال میں (۱۱۶۱ھ مطابق ۱۷۴۸ء) ہوا، اور دونوں "بادشاہوں" کی وفات کے درمیان فرق بھی چند ہفتوں کا رہا، دنیاوی بادشاہ محمد شاہ ربیع الثانی ۱۱۶۱ھ میں سدھارا، اور علمی شہنشاہ ملا نظام الدین محمد ۹ جمادی الاول ۱۱۶۱ھ کو عالم جاودانی کی طرف روانہ ہوئے۔ میاں عبد الباسط امیٹھوی نے ملا صاحب کی وفات کا مادۂ تاریخ نکالا ہے۔

ملک بود و بہ یک حرکت ملک شد

پورا قطعہ تاریخ اس طرح ہے :-

نظام الدین محمد واصل حق
چو از روئے زمیں سوئے فلک شد

وصال سال تاریخش فلک گفت
ملک بود و بہ یک حرکت ملک شد

ان ہی میاں عبد الباسط امیٹھوی نے ایک اور قطعۂ تاریخ بھی کہا تھا جس کی تقلید بعد میں بہت کی گئی، یہاں تک کہ مومن دہلوی کے اس مادۂ تاریخ کی بہت شہرت ہوئی جو انھوں نے شاہ عبد العزیز محدث دہلوی کی وفات پر نکالا تھا، یعنی

دست بے داد اجل سے بے سر و پا ہو گئے
فقر و دیں، فضل و ہنر، لطف و کرم، علم و عمل

مومن دہلوی سے تقریباً سو سال قبل میاں عبد الباسط امیٹھوی ملا نظام الدین کا حسب ذیل قطعۂ تاریخ کہہ چکے ہیں۔

در وفات مولوی، صاحب خصال
ہاتف تاریخ گفتش در مثال

در وفاتش بے سر و پا گشتہ اند
عشق و خیر و فیض و فضل و ہم کمال
۱۱۶۱ھ

کم و بیش پچاس سال تک ملا نظام الدین فرنگی محل میں درس دیتے اور اس حویلی کی شہرت کو بام عروج پر پہنچاتے رہے، مؤرخین مستقبل کی نظر میں "فرنگی محل" اسلامی علوم کی یونیورسٹی" اور "ہندوستان کا سب سے بڑا دار العلوم" بنتا چلا گیا، لیکن تقریباً سو سال بعد تک اس حویلی کی نسبت سے "فرنگی محلی" لکھنے کا کوئی سراغ نہیں ملتا، خود ملا نظام الدین اپنی تصانیف میں اپنے کو "سہالوی" لکھتے رہے۔ ان کے نامور فرزند ملا عبد العلی بحر العلوم (وفات ۱۲۲۵ھ) نے بھی اپنی تصانیف میں کہیں "فرنگی محلی" اپنے کو نہیں لکھا۔ ملا بحر العلوم کے ہم عصر اور وفات کے اعتبار سے ہم سال ملا محمد مبین فرنگی محلی نے بھی، نیز ان کے نامور جد امجد ملا احمد عبد الحق بن ملا سعید نے بھی اپنی تصانیف میں فرنگی محل کی نسبت سے اپنا تعارف کہیں نہیں کرایا ہے۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ابتدا میں "فرنگی محل" ذریعۂ تعارف نہ تھا، بلکہ لکھنؤ کا ایک محلہ تھا جس طرح دوسرے محلے کسی قصبے کے ہوا کرتے ہیں۔

معاصر مؤرخ علامہ غلام علی آزاد بلگرامی ملا نظام الدین سے اپنی ملاقات کا ذکر کرتے ہیں تو

فرنگی محل کا کوئی حوالہ وہ بھی نہیں دیتے ہیں :-

انا دخلت فی التاسع عشر من ذی الحجۃ الحرام سنۃ ثمان و اربعین بعد مأۃ و الف و اجتمعت بالملا نظام الدین فوجدتہ علی طریقۃ السلف الصالحین وکان یلمع علی جبینہ نور التقدیس

(سبحۃ المرجان)

میں ۱۹ ذی الحجہ ۱۱۴۸ھ میں لکھنؤ گیا اور ملا نظام الدین سے ملاقات کی، میں نے ان کو سلف صالحین کے طریقے پر پایا، ان کی پیشانی پر بزرگی کا نور تاباں تھا،

علامہ بلگرامی کی دوسری کتاب مآثر الکرام میں ملا نظام الدین کا تذکرہ ان الفاظ میں ملتا ہے:-

وہم در لکھنؤ رحل اقامت افگند و تمام عمر بہ تدریس و تصنیف اشتغال ورزید و اشتہار عظیم یافت امروز علمائے اکثر قطر ہندستان نسبت تلمذ بہ مولوی دارند و کلاہ گوشۂ تفاخر می شکنند و کسے کہ سلسلۂ تلمذ باو می رساند بین الفضلا علم امتیاز می افرازد و مردم بسیار را دیدہ شد کہ تحصیل جاہائے دیگر کردند برائے اعتبار فاتحہ فراغ از مولوی گرفتند

فقیر بتاریخ نوزدہم ذی الحجہ ۱۱۴۸ھ

لکھنؤ ہی میں قیام اختیار کر لیا اور تمام عمر درس و تدریس و تصنیف و تالیف میں گزار دی اور عظیم شہرت کے مالک ہوئے، آجکل ہندوستان کے اکثر اطراف کے علماء ملا نظام الدین سے شاگردی کی نسبت رکھتے ہیں اور تاج فخر و مباہات زیب سر کرتے ہیں، جو شخص ملا نظام الدین کی شاگردی کا سلسلہ رکھتا ہے وہ فضلائے عہد کے درمیان امتیاز و خصوصیت کا پرچم بلند کرتا ہے، بہت سے لوگوں کو دیکھا ہے کہ دوسری جگہوں میں تحصیل علم کی لیکن اپنا اعتبار بڑھانے کیلئے فاتحہ فراغ آکر ملا نظام الدین ہی سے پڑھا، فقیر (علامہ آزاد بلگرامی) نے ۱۹ ذی الحجہ ۱۱۴۸ھ

دربلدۂ لکھنؤ یک صحبت مولوی را دیدم	کو شہر لکھنؤ میں ملا صاحب کی ایک صحبت
طریقۂ سلف صالحین داشت و شعشعۂ تقدس	دیکھی ہے، سلف صالحین کا انداز رکھتے ہیں
از ناصیۂ ہمایوں می تافت۔ نہم جمادی الاول	اور بزرگی کی دمک انکی مبارک پیشانی سے
۱۱۶۱ھ سفر گزین ملک جاودانی شد	پھوٹ رہی تھی، ۹ جمادی الاول ۱۱۶۱ھ
آرام گاہ لکھنؤ۔	کو عالم جاودانی کی طرف سفر فرمایا، آخری آرام گاہ لکھنؤ ہے۔

علامہ بلگرامی نے ملا نظام الدین کی تاریخ وفات بھی کہی تھی:

عالم کامل امام عصر استاد جہاں	طائر روحش بہ سیر جنت الماوی شتافت
سال تاریخ وفات او بطور تعمیہ	گفتہ شد ملا نظام الدین دل فردوس یافت

"حویلی فرنگی" یا "فرنگی محل" یا "فرینکس کوارٹرس" نے تاریخ میں جو جگہ حاصل کی وہ ملا نظام الدین ہی کے پچاس سالہ غلغلۂ درس و تدریس کی بدولت حاصل کی، مرزا محمد حسن قتیل (وفات ۱۲۳۳ھ / ۱۸۱۷ء) ملا نظام الدین کو محمد شاہ بادشاہ کے زمانے کے "سرآمد علماء" قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"ملا قطب الدین سہالوی کے (جو ملا محب اللہ بہاری کے استاد کے استاد تھے) بیٹے ملا نظام الدین محمد شاہ بادشاہ کے زمانے میں سرآمد علماء سمجھے جاتے تھے، چنانچہ آج بھی (یعنی ملا نظام الدین کی وفات کے ستر بہتر سال بعد بھی جو ہفت تماشا کا زمانۂ تصنیف ہے) ہندوستان میں فاضلوں اور عالموں کا سلسلہ ان ہی پر منتہی ہوتا ہے، ان کے شاگرد ملا کمال الدین سہالوی نے ایک کتاب "عروۃ الوثقی" لکھی تھی جس کے دقائق و غوامض حل کرنے سے بڑے بڑے علماء عاجز ہیں، اگرچہ زمانۂ حال کے علماء کے استاد اول ملا نظام الدین مرحوم تھے، جن کی ذات سے لکھنؤ میں "فرنگی محل" کو شہرت و عزت حاصل ہے، لیکن ان کے پیر طریقت ..... (ہفت تماشا فارسی سے ترجمہ)

اس کے آگے مرزا قتیل کی عبارت خبط ہو گئی ہے، پیش نظر "ہفت تماشا" کا مطبوعہ نسخہ (نول کشور پریس) ہے، اس کا کوئی قلمی نسخہ اب تک دستیاب نہیں ہو سکا ورنہ یہ گتھی صاف ہو جاتی، مرزا قتیل کی مطبوعہ "ہفت تماشا" میں اس کے آگے جو عبارت ہے وہ یہ ہے:-

"لیکن ان کے پیر طریقت یہی ملا کمال الدین سہالوی گزرے ہیں۔" (فارسی ترجمہ)

یہ سراسر غلط بھی ہے، اور سیاق و سباق سے یہ ٹکڑا مطابقت بھی نہیں رکھتا ہے، بیچ میں کچھ عبارت ضرور رہ گئی ہے، مرزا قتیل کہنا یہ شروع کرتے ہیں کہ "زمانۂ حال کے علماء کے استاد اول اگرچہ ملا نظام الدین مرحوم تھے، اس کا اختتام یہ ہونا چاہیے تھا "لیکن ان کے پیر طریقت ناخواندہ اور امی محض تھے۔" اور یہ تاریخی حقیقت بھی ہے کہ ملا نظام الدین اور ان کے فاضل شاگرد ملا کمال الدین سہالوی دونوں کے پیر طریقت سید شاہ عبدالرزاق بانسوی تھے، جو تذکروں کی صراحت اور خود ملا نظام الدین کے بیان کے مطابق "امی محض" تھے، قتیل کی عبارت سے اگر اس کو تحریف شدہ یا مخبوط نہ سمجھا جائے، تاریخی حقیقت بدل کر رہ جائے گی، اس کے علاوہ "اگرچہ استاد اول تھے کیا خبر کہ ان کے پیر طریقت یہی ملا کمال الدین سہالوی گزرے ہیں" سے میل بالکل نہیں کھاتی، اس لیے کہ ملا کمال بھی علمائے عصر کی ایک بڑی تعداد کے استاد تھے، ان کے پیر طریقت ہونے میں اس قدر حیرت کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟

مرزا قتیل اس کے بعد ملا کمال الدین کے اجلۂ تلامذہ ملا برکت الہ آبادی، ملا احمد اللہ سندیلوی، ملا حسن فرنگی محلی، ملا حسن چریا کوٹی اور ملا عالم سندیلوی کا ذکر کرنے اور ملا نظام الدین کے نامور فرزند ملا عبد العلی بحر العلوم کو (جن کی وفات کو اس وقت تک دو سال بھی نہیں ہوتے تھے) خراج عقیدت پیش کرنے کے بعد لکھتے ہیں:-

"یہ سب بزرگ جن کا تذکرہ کیا گیا، سلسلۂ علماء کے شیوخ گزرے ہیں، ہندوستان میں

علم معقول جا بجا ان ہی حضرات سے پھیلا، کوئی طالب علم اور کوئی فاضل ایسا نہیں ہے
جو ان کی شاگردی کے حلقے سے باہر ہو، کوئی چھ واسطوں سے کوئی سات واسطوں سے اور
بعض اس سے بھی کم واسطوں سے ان حضرات سے شرف تلمذ رکھتے ہیں۔" (ہفت تماشا فارسی ترجمہ)

بہرحال فارغ التحصیل ملا نظام الدین محمد کی مسند درس بچھنے کے بعد ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ طلبۂ علوم کی توجہ اس طرف کب مبذول ہوئی، ایک پچیس سالہ فارغ التحصیل نوجوان استاد کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کرنے کی بات اور ہے لیکن اس استاد کی اہمیت محسوس کرنے کی وجہ کیا ہو سکتی تھی، جبکہ اس نوجوان کی علمی اور تدریسی استعداد کا اظہار ابھی صفر کے درجے سے آگے نہیں بڑھ پایا ہے، اس عمر کے کئی اور فارغ التحصیل ذی استعداد اساتذہ اور بھی ہوں گے، پھر ملا نظام الدین کی طرف طلبۂ علم کی کشش کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ اس کا مجمل جواب تو یہی ہے کہ ان کے طریقۂ درس کی شہرت بہت جلد ہو گئی، اور ان کے نصاب تعلیم کے فوائد جس کو ان ہی کی نسبت سے "درس نظامی" کہا جانے لگا، بہت تیزی سے ظاہر ہونے لگے، سب سے بڑا فائدہ تو یہی تھا جس کی طرف ملا محمد ولی اللہ فرنگی محلی نے ملا قطب الدین شہید کی وجہ شہرت کے سلسلہ میں اشارہ کیا ہے یعنی "تحصیل فراغ بسیار از مردمان بخدمت ایشان" (بہت کم مدت میں طلبہ کو فارغ التحصیل کر دینا)۔ ملا نظام الدین کے درس سے کتنی جلد طلبہ فارغ التحصیل ہو جاتے تھے، اس کی ایک حیرت انگیز مثال ان کے ارشد تلامذہ میں ملا کمال الدین سہالوی کے احوال سے ملتی ہے۔

ملا کمال کا ستر سال (کم و بیش) کی عمر میں $\frac{۱۱۷۵}{۱۷۶۱}$ھ میں (۱۴ محرم الحرام کو) انتقال ہوا اس حساب سے ان کی پیدائش لگ بھگ ۱۱۰۴ھ میں ہوگی، ان کی ابتدائی تعلیم متوسطات تک ان کے وطن فتحپور میں ہوئی، ملا قطب الدین کی شہادت کے بعد اولاد ملا قطب نے جس طرح سہالی چھوڑ کر لکھنؤ آباد کیا تھا، اسی طرح ملا کمال کے والد ماجد قاضی دولت سہالوی نے بھی جو ملا قطب کے شاگرد اور

متبنی تھے، سہالی چھوڑ دیا تھا:۔

چوں قصۂ شہادت ملا قطب الدین شہید	جب خانہ زادوں کے ہاتھوں ملا قطب الدین
از دست قوم خانہ زادہا بظہور رسید	شہید کا واقعۂ شہادت ظہور پذیر ہوا کہ
و بے سبب و ناحق ملا شہید را شہید کردند	بے سبب اور ناحق ان کو شہید کر دیا، قاضی
قاضی محمد دولت را بود و باش قصبۂ سہالی	محمد دولت کو سہالی میں بود و باش ناگوار
ناگوار افتادہ ناچار قاطبۃً ترک کردند	ہو گئی، مجبوراً سہالی کو کلیتہً ترک کر کے
و در قصبۂ فتحپور ...... اقامت گزیدند	فتحپور میں ....
(اغصان الانساب مخطوطہ مملوکہ مولانا محمد میاں صاحب)	قیام اختیار کر لیا۔

اغصان الانساب کے مصنف مولوی رضی الدین محمود انصاری فتح پوری نے جو ملا کمال کے ہم جد ہیں، لکھا ہے:۔

در ابتدائے حال کتب مختصرہ از میراں	(ملا کمال سہالوی نے) شروع میں چھوٹی
کمال الدین ساکن بنگالہ شاگرد ملا	کتابیں بنگال کے رہنے والے میراں
نظام الملۃ والدین محمد قدس سرہ بودند	کمال الدین سے پڑھیں جو ملا نظام
خواندہ،	الملۃ والدین محمد کے شاگرد تھے۔

اور میراں کمال الدین بنگالی کے بارے میں بہت صراحت سے صاحب اغصان الانساب نے لکھا ہے:۔

چوں میراں کمال الدین از استاد خود	میراں کمال الدین بنگالی جب اپنے استاد
کتب درسیہ خواندہ فارغ شدند در فتحپور	(ملا نظام الدین محمد) سے کتب درسیہ پڑھ کر
آمدہ تدریس آغاز نہادند دریں اثنا	فارغ التحصیل ہو گئے تو فتحپور آ کر انھوں نے

ملا کمال الملۃ والدین محمد قدس سرہ از کتابہائے مختصرات فراغت گرفتند

پڑھانا شروع کر دیا، اسی دوران میں ملا کمال الملۃ والدین محمد نے چھوٹی درسی کتابوں سے فراغت حاصل کر لی،

یہ مذکور ہو چکا ہے کہ ملا نظام الدین کی مسند درس ۱۱۱۵ھ یا ۱۱۱۶ھ میں بچھی تھی، اس وقت ملا کمال سہالوی کی عمر کیا ہو گی؟ یہی دس، گیارہ سال کے ہونگے، ابتدائی نوشت و خواند ان کی شروع ہو چکی ہو گی، اب کیا مدت فرض کی جائے، ان کے مختصراتِ درسیات شروع کرنے کی؟ ابتدائی نوشت و خواند کے تین چار برس بعد، یعنی اندازاً ۱۱۱۸ھ یا ۱۱۱۹ھ اور ان تین چار برسوں میں میران کمال الدین بنگالی، ملا نظام الدین سے کتب درسیہ تمام کر کے فارغ التحصیل ہو جاتے ہیں، اور فتحپور آ کر ملا کمال کے استاد بن جاتے ہیں، فارغ التحصیل ہونے کے لیے اتنی قلیل مدت (چار، پانچ سال صرف) کو عقل بآسانی قبول نہیں کر سکتی لیکن انکار بھی نہیں کر سکتی، ورنہ تاریخ کی صراحتوں سے انکار کرنا پڑے گا، سوائے اس کے کہ یہ مانا جائے کہ لکھنؤ میں آ کر ملا غلام نقشبند سے رسالہ قوشجیہ پڑھنے کے دوران ہی میں ملا نظام الدین نے درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا تھا،

جب بھی درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا گیا ہو، ۱۱۱۵ھ اور ۱۱۱۶ھ میں یا اس سے قبل (ایسے ہی بعض قرائن سے میرا ذاتی رجحان یہ ہے کہ ملا نظام الدین کے فارغ التحصیل ہونے کی مدت جو دس سال (۱۱۰۵ھ سے ۱۱۱۵ھ تک) تخمیناً بتائی جاتی ہے، اس کو کم ہونا چاہیے جب کہ وہ ۱۱۰۵ھ میں شرح ملا جامی تک پڑھ چکے تھے، یہ مدت سات سال میں محدود رکھی جائے تو سب خلشیں دور ہو جاتی ہیں) بہر حال ملا صاحب کے اولین تلامذہ میں یہی میران کمال الدین بنگالی کے علاوہ خود اپنے حقیقی بھتیجے احمد عبد الحق بن ملا محمد سعید، عبد العزیز بن ملا محمد سعید ابن ملا اسعد تھے، غلام مصطفیٰ اپنے جد ملا قطب شہید کی حیات میں پیدا ہو چکے تھے، اور احمد عبد الحق عین زمانۂ شہادت

(۱۹ رجب ۱۱۰۳ھ) کو پہلے سہالی میں پیدا ہوئے تھے، ان کے چھوٹے بھائی عبد العزیز کی ولادت لکھنؤ فرنگی محل میں (۱۱۰۵ھ) ہوئی، ملا عبد العزیز بن ملا محمد سعید پہلے مولود ہیں جو خاندان ملا قطب شہید کے فرنگی محل میں آباد ہونے کے بعد تولد ہوئے، ملا نظام الدین کے فارغ التحصیل ہونے کی جو مدت بھی فرض کر لیجائے (حد سے حد ۱۱۱۵ھ بھی) یہ تینوں بھتیجے اس وقت بچے ہی تھے، اور ان کو پڑھانے والا درکار تھا، حقیقی چھوٹے بھائی محمد رضا بن ملا قطب شہید کے بارے میں اغصان الانساب کے مصنف نے لکھا ہے:-

جملہ کتب درسیہ از برادر خود مولانا نظام الملۃ والدین قدس سرہ خواندہ بتدریس بندگان پرداختند و عالمے از ذات ایشان خزائن علوم اندوختند و لیل و نہار کمر ہمت بر درس محکم بستہ بودند

ملا محمد رضا نے تمام درسی کتابیں اپنے چھوٹے بھائی (تین بڑے بھائیوں میں سب سے چھوٹے) مولانا نظام الدین سے پڑھیں اور بندگان خدا کو پڑھانا شروع کر دیا، ایک دنیا نے ان کی ذات سے علوم کے خزانے ذخیرہ کر لیے رات دن درس و تدریس میں استقلال کے ساتھ مصروف و منہمک رہتے تھے،

ملا محمد رضا کی شاگردی بحث طلب مسئلہ اس لیے ہے کہ خاندان فرنگی محل کے تمام حوالے اس کے خلاف ہیں، اور درایت بھی اس کی موید نہیں ہے، ملا نظام الدین اور ملا محمد رضا کو "ہم پیر" اور "ہم استاد" ہر موقعہ پر کہا گیا ہے، اگرچہ ملا محمد رضا کے اساتذہ کی صراحت نہیں ملتی ہے، ملا عبد الاعلیٰ فرنگی محلی (وفات ۱۲۰۷ھ) لکھتے ہیں:-

بعدہ تارک دنیا شدہ مرید حضرت سید عبد الرزاق بانسوی شدہ پس ہم پیر برادر خود شدند

ملا محمد رضا نے اس کے بعد ترک دنیا اختیار کر لی اور حضرت سید عبد الرزاق بانسوی کے مرید ہو گئے،

چنانچہ ہم استاد بودند — اس طرح وہ اپنے بھائی (ملا نظام الدین) کے ہم پیر

(رسالہ قطبیہ قلمی) — بھی ہو گئے، جس طرح "ہم استاد" تھے۔

ملا محمد ولی اللہ فرنگی محلی (وفات ۱۲۷۰ھ) شاگردی کا ذکر کیے بغیر صرف یہ لکھتے ہیں:۔

محمد رضا مذکور اولاً تحصیل علوم کردہ در جنب — محمد رضا تحصیل علم کر کے پہلے تو اپنے بڑے بھائی

برادر بزرگ بتدریس علوم مشغول گشتہ بعد ازاں — کے پہلو بہ پہلو بیٹھ کر درس دینے میں مشغول ہو گئے،

بیاد مولیٰ اشتغال نمود (عمدۃ الوسائل قلمی) — اس کے بعد درس و تدریس ترک کر کے یاد خدا میں کھو گئے۔

ملا محمد رضا اپنے نامور بھائی ملا نظام الدین سے چار ہی پانچ سال چھوٹے تھے، جب ملا نظام الدین سولہ سال کی عمر میں تحصیل علم کے لیے وطن سے نکلے تو ملا محمد رضا بھی گیارہ بارہ برس کے تھے، اور اس عمر میں تحصیل علم کیلئے گھر سے نکلنا جبکہ دیوہ (ضلع بارہ بنکی) اور جائس (ضلع رائے بریلی) جیسے قریبی مقامات ہی تک جانا ہے، ذرا بھی خلاف معمول بات نہیں ہے، اس لیے بڑے بھائی کے ہمراہ چھوٹے بھائی کا دیوہ، جائس اور بنارس کے اساتذہ سے تعلیم حاصل کر کے "ہم استاد" ہونا محل حیرت نہیں، یہ ضرور محل تعجب ہوتا کہ ملا نظام الدین کے فارغ التحصیل ہو کر وطن واپس آنے کے انتظار میں پڑھائی چھوڑے ملا محمد رضا بیٹھے رہتے، خصوصاً اس حالت میں جبکہ ایک روایت کے مطابق ملا رضا صاحب صرف دو سال ملا نظام الدین سے چھوٹے تھے،

ملا محمد رضا کی شاگردی کی روایت مذکورہ تصریحات کی روشنی میں خاصی مخدوش ہو جاتی ہے، اور "ہم استاد" ہونے کی متواتر روایت کو تقویت اس جملے سے بھی ایک حد تک ہوتی ہے کہ "در جنب برادر بزرگ بتدریس علوم مشغول گشتہ" بڑے بھائی کے پہلو بہ پہلو درس دینے بیٹھ گئے یعنی دونوں بھائی ساتھ ساتھ پڑھ کر فارغ التحصیل ہوئے اور ساتھ ہی ساتھ درس و تدریس میں مشغول ہو گئے، ملا نظام الدین کے پڑھائے ہوئے بھتیجوں اور ان کی اولاد نے بھی فارغ التحصیل ہونے کے بعد درس و تدریس ہی اپنا مشغلہ رکھا، جیسے ملا احمد عبدالحق ابن ملا محمد سعید، ملا احمد حسین بن ملا محمد رضا، ملا محمد ولی حفید، ملا محمد اسعد اور ملا بحر العلوم بن ملا نظام الدین وغیرہ

اور ان سب نے ملا نظام الدین کے سامنے ہی درس و تدریس شروع کر دیا تھا، ملا محمد رضا، آخر عمر میں "قال" سے "حال" کی منزل میں چلے گئے تھے، اس لیے ان کے احوال میں تذکرہ نویس بس سرسری سا ذکر درس و تدریس کا کر کے "حال" کے ذکر میں صفحوں کے صفحے لکھتے چلے جاتے ہیں، حتیٰ کہ اگر "ہم پیر" ہونے کے ذکر میں "ہم استاد" کی بات ان کے قلموں سے نکل نہ گئی ہوتی تو ملا رضا کی تعلیم کے بارے میں ہلکی سی روشنی بھی ملنا دشوار ہو جاتا، ان کی قابل قدر تصانیف بھی ان کی بے توجہی سے خاندان کے ذخیروں میں محدود ہو کر رہ گئی ہیں،

اس سے یہ نتیجہ بھی ہاتھ آجاتا ہے کہ ملا نظام الدین کی درس گاہ میں، جس کو بعد کے مورخین "مدرسہ ملا نظام الدین" کے نام سے یاد کرتے ہیں، ابتداءً دو مدرس تھے، ایک خود ملا صاحب دوسرے انکے پہلو بہ پہلو ملا محمد رضا، یہ دونوں بھائی کثیر التعداد طلبہ کے درس کی ذمہ داریوں کو باہم تقسیم کیے ہوئے تھے، اور جب ملا محمد رضا "بعد ازاں بیاد مولیٰ اشتغال نمود" کی صراحت کے مطابق درس و تدریس سے دست کش ہو گئے، جو بہر حال تدریس کو دس بارہ سال جاری رکھنے کے بعد کی بات ہے، تو ملا نظام الدین کے بھتیجے ملا احمد عبدالحق اور ملا غلام مصطفیٰ بن ملا اسعد فارغ التحصیل ہو چکے تھے، بڑے بھتیجے ملا غلام مصطفیٰ ملا دان کے قاضی ہو کر فرائض عدالت انجام دینے لگے، اور ملا احمد عبدالحق مددگار مدرس رہے، "تحصیل کتب درسیہ بجد متش نمودہ در جنب او بتدریس مشغول گشت و تصانیف در معقولات نمودہ"۔ (ملا نظام الدین کی خدمت میں تحصیل علم کرنے کے بعد ان کے برابر ہی درس میں مشغول ہو گئے اور فن معقولات میں کتابیں لکھیں)

"و اعتبار تمام در ارباب علم و اراکین شہر پیدا کردہ متکفل ضبط و ربط مقدمات خانگی و وجاہت ریاست چنانکہ می بایست نمودہ"۔ (اہل علم و عمائدین شہر میں عزت حاصل کی اور خاندانی امور اور جائیداد کے نظم و ضبط میں، جیسا کہ چاہیئے دلچسپی بھی لیتے رہے) (اغصان اربعہ از ملا ولی اللہ فرنگی محلی مطبوعہ)

درس و تدریس میں مشغول ہونے کے باوجود ملا احمد عبدالحق نے اپنے نامور چچا ملا نظام الدین کو امور خانگی

سے اس طرح بے نیاز کر دیا کہ ملا نظام الدین ،

ہمیشہ از مرداں می گفت کہ بدولت میاں احمد عبد الحق نظام الدین نظام الدین شد کہ اوشاں ملامت دنیا و رنج ہمہ امورات برخود گرفتند و من باطمینان تمام بتدریس علوم مشغول می باشم (اغصان اربعہ مطبوعہ صفحہ ۱۳۴)

ملا نظام الدین ہمیشہ لوگوں سے فرمایا کرتے تھے کہ میاں احمد عبد الحق (بھتیجے) کی بدولت نظام الدین نظام الدین بنے، انھوں نے دنیا کی الجھنیں اور تمام معاملات کی پریشانیاں اپنے سر لے لیں اور میں پورے اطمینان کے ساتھ درس و تدریس میں مشغول ہو گیا،

اس کا مطلب یہی ہوا کہ درس و تدریس کی اصل ذمہ داری ملا نظام الدین اپنے ہی سر لیے رہے اور بجا طور پر ان کی درسگاہ "مدرسہ ملا نظام الدین" کے نام سے تاریخ میں یاد کی جاتی ہے، لیکن ایسی کوئی عمارت جو مدرسہ کہلاتی ہو، ملا نظام الدین کے زمانے میں فرنگی محل میں نہ تھی، ان کا گھر یا گھر سے متصل مسجد ہی انکی درسگاہ ہونا چاہیے، مسجد میں درس دینے کی روایت ایک واقعہ کے ضمن میں ملا بحر العلوم سے ہے:-

چنانچہ روزے مولانا علیہ الرحمۃ بگوشہ مسجد نشستہ مرا درس می دادند کہ دریں ہنگام دو جوان خوبترو بمسجد در آمدند الخ (عمدۃ الوسائل قلمی)

(ملا بحر العلوم بیان کرتے ہیں) چنانچہ ایک دن مولانا رحمۃ اللہ علیہ (ملا نظام الدین) مسجد کے کونے میں بیٹھے مجھے پڑھا رہے تھے کہ دو خوبرو نوجوان مسجد میں آگئے الخ

اور یہ مسجد بھی بعض خاندانی روایات کی رو سے ملا صاحب کے زمانہ میں تعمیر ہوئی تھی، "حویلی فرنگی محل" کا قدیمی جزو نہ تھی، اور نہ ہونا چاہیے تھی، یہ بھی مسموع ہوا ہے کہ محراب مسجد کے شمالی حصے میں جو منبر ہے اس کے تین زینوں میں سے اوپر کے زینے کا پتھر ملا صاحب کے پیر و مرشد حضرت سید شاہ عبد الرزاق بانسوی رحمۃ اللہ علیہ کے دست مبارک کا رکھا ہوا ہے، اور یہ خود اپنی آنکھوں کا دیکھا ہوا ہے کہ مرشدی حضرت مولانا عبد الباری فرنگی محلی خطبہ جمعہ کے لیے جب منبر پر کھڑے ہوتے تھے تو ادباً تیسرے (آخری زینے) پر نہیں کھڑے ہوتے تھے، بلکہ دوسرے زینے

سے خطبہ دیتے تھے، یہی معمول مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے بعد ان کے جانشینوں اور اماماں جمعہ کا اب تک ہے، اس کی وجہ یہی بتائی جاتی ہے کہ اوپر کی سیڑھی کا پتھر حضرت سید صاحب بانسویؒ کے دست مبارک کا رکھا ہوا ہے اس لیے اس کو زیر پا نہ آنا چاہیے۔

امور خانگی اور معاملات زمینداری، جن کے متکفل ملا صاحب کے بھتیجے ملا احمد عبد الحق رہے، کیا تھے؟ اس کی تفصیل صاحب اغصان اربعہ نے جو خاندان فرنگی محل کے ممتاز مورخ تھے، اس طرح بیان کی ہے:-

ہرچند فرنگی محل بفرمان بادشاہی معاف شدہ بود لیکن رعایائے متعلقہ آں قبضہ نمی دادند و تمرد و سرکشی داشتند بمساعی جمیلہ ملا احمد عبد الحق زیر و زبر شدند و سر برعیت گری نہادند و سرخط کرایہ بنام او نوشتہ دادند چراکہ بسبب حلمیکہ مولانا نظام الدین داشتند شکستگی خاطر احدے برو ناگوار بود ہر کس کہ بخدمت او نالش ملا احمد عبد الحق می کردند می فرمودند کہ اوشاں مالک اند ہرچہ خواہند بکنند من اختیار ندارم (اغصان اربعہ از ملا ولی اللہ فرنگی محلی مطبوعہ)

اگرچہ فرنگی محل شاہی فرمان کے تحت ہبہ ہوا تھا لیکن ان عمارات پر قابض لوگ قبضہ نہیں دیتے تھے اور سرکشی اختیار کیے ہوئے تھے، ملا احمد عبد الحق کی کوششوں سے یہ لوگ زیر ہوئے اور کرایہ داری کے سرخط ملا احمد عبد الحق کے نام لکھے گئے، اس لیے کہ ملا نظام الدین کے مزاج میں ایسی نرمی تھی کہ کسی شخص کی بھی دل شکنی ان کو ناگوار معلوم ہوتی تھی، اور جب لوگ (رعایا) ملا احمد عبد الحق کے خلاف ملا نظام الدین سے اپیل کرتے تھے تو وہ فرماتے تھے کہ "ملا احمد عبد الحق ہی مالک ہیں، جیسا چاہیں کریں، مجھے انکی کارروائیوں میں دخل دینے کا اختیار نہیں ہے۔

مذکورہ اقتباس سے، جو ایک ایسے کی تحریر کا ہے جو فرنگی محل کے علمائے فرنگی محل سے آباد ہونے کے صرف پچھتر سال بعد اس خاندان میں پیدا ہوا تھا، مزید وضاحت ہو گئی کہ فرنگی محل یا حویلی فرنگی محض ایک مکان نہ تھا، بلکہ اصل حویلی کے ساتھ متعلقات حویلی بھی تھے، جن میں کرایہ دار رہتے تھے، جو خاندان ملا قطب الدین کی ملکیت

مانے اور قبضہ دینے میں سرکشی سے کام لے رہے تھے اربنیر کے سفرنامے کا یہ ٹکڑا "فرنگی محل یا فرنگیس کوارٹر میں" اور فرمان شاہی کا یہ اشارہ "یک منزل حویلی فرنگی با متعلقہ آن" اس اقتباس کی روشنی میں بہت واضح ہو جاتا ہے۔

ملا قطب الدین شہید کا کنبہ جب اس حویلی میں منتقل ہوا ہے تو نصف درجن کے قریب مرد و زن و اطفال سے زیادہ پر مشتمل نہ تھا، یعنی ملا سعید بن ملا قطب الدین شہید، بیوۂ ملا قطب شہید، والدۂ ملا قطب شہید، زوجۂ ملا محمد اسعد اور ان کے ایک کم عمر بیٹے ملا غلام مصطفےٰ، زوجۂ ملا سعید اور ایک نوعمر بیٹے ملا محمد احمد عبد الحق، ملا نظام الدین اور ان کے چھوٹے بھائی ملا محمد رضا، اس چھوٹے سے کنبے کے لیے اصل حویلی فرنگی، کافی تھی، متعلقاتِ حویلی سے قابضوں کی بے دخلی کی کوئی ضرورت اس وقت نہ تھی، مولانا عنایت اللہ مرحوم فرنگی محلی لکھتے ہیں:-

"اس کوٹھی (اصل حویلی) میں سب لوگ سکونت پذیر ہوئے، جب اولاد بڑھی اور جگہ کی تنگی ہوئی تو ملا نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ نے اس کوٹھی کے جنوب جانب اور ملا رضا نے شمال جانب اور ملا اسعد کی اولاد نے اس کوٹھی کے اصطبل کو کھدوا کر مکانات بنوا لیے ملا سعید کے صاحبزادے (ملا احمد عبد الحق اور ملا عبد العزیز) اسی میں (اصل حویلی میں) رہتے رہے، ملا عبد العزیز کا نکاح مفتی مراد کی بیٹی سے ہوا تھا، اور اہل و عیال محلہ "سوت ہٹی" میں مفتی مراد کے یہاں قیام پذیر تھے، اس لیے یہ کوٹھی (حویلی) مولانا عبد الحق کا مسکن رہی۔"

(تذکرہ علمائے فرنگی محل مطبوعہ)

اولاد بڑھنے اور جگہ کی تنگی ہونے کے بعد ہی "متعلقات حویلی" کو اپنے قبضہ میں لینے اور حسب ضرورت اس کی تعمیر میں رد و بدل کرنے کا ارادہ کیا گیا ہوگا اور اس وقت ملا نظام الدین ایک مشہور شخصیت ہو چکے تھے، طلبۂ علوم جوق در جوق ان کی خدمت میں آنے لگے تھے، درس و تدریس

کے انہماک میں ان کو خاندان کے بڑے اور بزرگ ہونے کے باوجود جائیداد کی طرف توجہ کرنے کی فرصت ہی نہ تھی، اس لیے کچھ دنوں ملا صاحب کے چھوٹے بھائی ملا محمد رضا یہ ذمہ داری سنبھالے رہے،

(مختار امور خانگی مولوی محمد رضا بود	خانگی امور کے مختار کل ملا محمد رضا رہے
پس وے مولوی عبد الحق	(وہ "قال" سے حال میں چلے گئے، پھر گھربار
(محاسن رزاقیہ قلمی از ملا عبد الاعلیٰ	وطن اور ملک چھوڑ کر مدینہ منورہ چلے گئے تو)
فرنگی محلی، حفید ملا نظام الدینؒ)	ان کے بعد ملا احمد عبد الحق نے مختار کل
	کے فرائض انجام دیے۔

بہرحال ملا نظام الدین کی درسگاہ حویلی فرنگی کی اصل عمارت تھی، یا مسجد فرنگی محل، یا حویلی کے جنوب میں ملا صاحب کا تعمیر کردہ مکان تھا، درسگاہ میں زیر تعلیم طلبہ کا قیام کہاں رہتا تھا؟ دو چار یا دس پانچ طلبہ کے لیے یہ قیاس کر لینا ممکن بھی ہے کہ استاد کی دی ہوئی کسی جگہ یا قریبی مسجد میں رہتے ہوں گے، مگر ملا صاحب کے طلبہ کی کثرت کے پیش نظر یہ قیاس کام نہیں دے سکتا، روایات یہ بتاتی ہیں کہ ملا صاحب کے طلبہ فرنگی محل سے تقریباً ایک میل دور واقع مزار شاہ پیر محمدؒ پر رہتے تھے،

"باقی"

مقالات شبلی تعلیمی

(سوم)

اس میں تعلیم سے متعلق وہ تمام مضامین، مثلاً مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم، مدرسے اور دار العلوم، ملا نظام الدین بانی درس نظامیہ اور ندوہ اور نصاب تعلیم وغیرہ جو الندوہ میں شائع ہوئے تھے اکٹھا کر دئے گئے ہیں، جن سے مولانا شبلی کے تعلیمی خیالات و نظریات پر بڑی اچھی روشنی پڑتی ہے، قیمت [illegible]

دربار اکبری کا ایک غیر معروف شاعر

ثنائی[1]

از جناب ڈاکٹر نصیر احمد صاحب صدیقی

ثنائی کا شمار فارسی زبان کے ان ممتاز شعرا میں ہے، جنھوں نے ایک طرف ایران کے درباروں کو اپنی نوا سنجی سے رشک چمن بنایا، اور دوسری طرف ہندوستان کی شاہی محفلوں کو اپنے نغموں سے گرمایا۔

اس کا پورا نام "خواجہ حسین" اور تخلص "ثنائی" تھا، اس کے بارے میں تقریباً تمام تذکرہ نگاروں کا اتفاق ہے،

بعض مخطوطوں میں "ثنائی" (م ۹۹۵ھ) کو "حکیم سنائی" (م ۵۲۵ھ) سے ملتبس کر دیا گیا ہے،[2] جو کسی طرح درست نہیں،

خاندان | مآثر رحیمی کا مصنف ثنائی کے علو نسب و حسب کی تعریف کرتا ہے، ثنائی کے باپ کے نام میں تذکرہ نگاروں کا اختلاف پایا جاتا ہے، چنانچہ آذر نے آتشکدہ میں اس کا نام "مرزا عنایت" بتایا ہے،

عبد النبی نے میخانہ میں[3] "غیاث الدین علی" لکھا ہے، ان کے برخلاف مآثر رحیمی[4] اور خلاصۃ الاشعار[5]

[1] سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب نے بزم تیموریہ میں ثنائی کا مختصر ذکر کیا ہے، اس مضمون میں اسکی تفصیل پیش کی جاتی ہے۔
[2] دیوان ثنائی (جواہر میوزیم، آزاد لائبریری، علی گڑھ) [3] میخانہ، ص ۱۱۱ (نثر عالم، کلکشن آزاد لائبریری علی گڑھ
[4] مآثر رحیمی، ص ۳۵۴، ج سوم (آزاد لائبریری علی گڑھ [5] خلاصۃ الاشعار، علمی (حبیب گنج کلکشن آزاد لائبریری، علی گڑھ)

کے مصنف نے "غیاث الدین، محمد تحریر کیا ہے، بلاخیین نے بھی دیباچہ دیوان ثنائی کے حوالہ سے "غیاث الدین محمد" ہی کو صحیح قرار دیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ آتشکدہ کے مصنف نے غلطی سے "غیاث" کو "عنایت" پڑھ لیا۔ ہمارے نزدیک بھی غیاث الدین محمد ہی لائق ترجیح ہے۔

بعض اہل تذکرہ نے غیاث الدین محمد کے ساتھ "بزازی" کی نسبت کا اضافہ کیا ہے، جو ممکن ہے مشتبہ ہو، کیونکہ ثنائی کے باپ کے بارے میں صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ پیشہ کے لحاظ سے بزاز تھا، مگر اس صورت میں اس کے لیے صرف لفظ "بزاز" کافی تھا، بزازی کی نسبت کی کوئی معقول وجہ نہیں معلوم ہوتی، میخانہ کے مصنف نے اس کی بھی صراحت کی ہے کہ اس پیشہ سے اس کا کاروبار کافی ترقی کر گیا تھا،

"اوقات بہ بزازی میگذرانیده، تا دراں پیشہ سامان بسیاری بہم رسانیده است ——"

مولد | مشہد مقدس خراسان کے شمال مشرق میں ہے اور امام ہشتم حضرت ابو الحسن علی الرضا کے مرقد کی وجہ سے زیارت گاہ خاص و عام ہے، علم و ادب کے نقطۂ نظر سے بھی مشہد کو خاص اہمیت حاصل ہے، چنانچہ غزالی، قدسی، نظیری، مشرقی، نسبتی، واقفی، اقدسی، دانشی، باذل، قاسم دیوانہ جیسے شعرا اسی خاک پاک سے اٹھے اور اپنے اپنے زمانے میں شعر و سخن کی شمعیں روشن کر گئے۔ ثنائی کو بھی اسی سرزمین سے نسبت ہے۔[1]

ابتدائی زندگی اور علمی استعداد | مشرقی شاعری خصوصاً فارسی اور اردو شاعری پر بجا طور سے یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس میں مقامی رنگ نہ ہونے کے برابر ہے، شعراء کے قصائد اور غزلیات کے دفتر کے دفتر پڑھ جایئے اور یہ پتہ نہیں چلتا کہ شاعر نے کس ماحول میں زندگی بسر کی، اس کے ابتدائی حالات کیا تھے،

[1] مآثر رحیمی، ص ۳۵۴ ج سوم - میخانہ، ص ۱۹۸ - عالم آرای عباسی، ص ۱۸۱ ج اول - تذکرۃ الشعراء ص ۲۴۴ - تذکرہ تاریخ الافکار ص ۱۳۳ -

ملک میں سیکڑوں انقلابات اور حوادث رونما ہوتے ہیں مگر شاعر اپنے گرد وپیش سے ایسا بے خبر اور بے تعلق ہوتا ہے کہ گویا وہ مادی دنیا سے ماورا کوئی دوسری مخلوق ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ان شعراء کے کلام میں (بلکہ ان کے ذہن میں) زمان ومکان کا تصور اتنا مبہم اور غیر واضح ہوتا ہے کہ اس کی بنا پر ہم ان کی زندگی کے بارے میں کوئی قطعی دعویٰ نہیں کر سکتے اور نہ ان کے بیانات سے ان کے ممدوحین کی نسبت کوئی یقینی بات کہی جا سکتی ہے۔

ان حالات میں ثنائی کا کلام بھی ہماری رہنمائی کرنے سے قاصر ہے، تلاش کے باوجود اس کے مجموعۂ اشعار اور تذکروں میں بھی اس کی صراحت تو کیا، اشارہ بھی نہیں ملتا جس سے اس کے دربار شاہ ایران سے توسل یا شہزادہ ابراہیم میرزا سے وابستگی کی تفصیلات یا خود شاعر کی عمر اور اس کی زندگی کے واقعات جاننے میں مدد ملے، البتہ اس کی علمی استعداد کے بارے میں تھوڑی سی واقفیت ہو جاتی ہے۔ اس سلسلے میں بھی جو کچھ ملا وہ اس کے کلام کے مطالعہ سے ملا ہے، کسی خارجی ذریعہ سے حاصل نہیں ہوا، اس نے اپنے دیوان میں جو دیباچہ لکھا تھا[1] اس میں بھی کچھ نہیں ہے۔

علوم متداولہ سے ثنائی کی شناسائی کا قیاس اس بنا پر کیا جا سکتا ہے کہ اس کا تعلق ایک خوشحال گھرانے سے تھا۔ اس کے علاوہ اس کے اشعار میں بعض علوم کی اصطلاحات کا بے تکلف و برمحل استعمال ملتا ہے، اور ایسے بہت سے اشعار ہیں کہ ان میں ہیئت یا ہندسہ کی اصطلاحوں کا برمحل اور بے تکلف استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً

باغیر چرخ پنجہ مروی در افگنم	گر یک رہم دہی بمیانِ سگاں نشست
چرخ از محیط جاہ تو خود را بروں ندید	نقطہ ز خطِ دائرہ کے برکراں نشست

---

[1] آتشکدۂ رحیمی ص ۵-۳ ج سوم

زہرہ کو اصل شادمانیہاست	دو لبئی نغمۂ رباب غمست
دریغ کہ قہرمان چرخ خست	در گشتن کس امان ندیداست
ز اشئی در گہ ترا چرخ	بر وائی ہفتمین نوید

اس کے علاوہ اس کے اشعار میں بعض غیر معروف تلمیحیں بھی نظر آتی ہیں۔ مثلاً

منم نوحی کہ از طوفان جہانرا در امان دارد	بہبود کسان دستِ دعا بر آسمان دارد

حضرت نوحؑ اور ان کے طوفان کا واقعہ کون نہیں جانتا، لیکن ثنائی نے شعر مذکور کے مصرع ثانی میں حضرت نوحؑ کی جس دعا کی طرف اشارہ کیا ہے، اس تک خیال آسانی سے نہیں پہنچتا[1]۔

اسی طرح جہاں حضرت موسیٰؑ اور سامری کی متعارف تلمیح ہے، وہاں حضرت موسیٰ کا اپنے بھائی حضرت ہارونؑ سے ناراض ہونا ایسا واقعہ ہے جو نسبتاً غیر معروف ہی، ثنائی لکھتا ہے:

گاہ از سحر سامری نفسی	موسیٰ با برادر اندازد

قصیدہ نگاری

ثنائی کی شہرت زیادہ تر اس کے قصائد کی وجہ سے ہے، قصائد میں وہ خاقانی کا مقلد تھا، اس کی زمینوں میں اس نے متعدد قصیدے کہے ہیں، مثلاً

خاقانی	ثنائی
۱- صبحدم چوں کلہ بند د آہ دود آسائے من	۱- صبحدم طوفاں کند چوں چشم طوفاں زائے من
چوں شفق در خوں نشیند چشم شب پیمائے من	ساغر خورشید گردد جام خوں پیمائے من
۲- صبح چوں زلف شب براندازد	عشق ہر جا سخن در اندازد
مرغ صبح از طرب سر اندازد	زہرہ شیر ثریاں براندازد

---

[1] رَبِّ اغْفِرْلِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِمَن دَخَلَ بَيْتِيَ مُؤْمِنًا وَّلِلْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ (نوح - رکوع ۲)

اے میرے پروردگار میری اور میرے ماں باپ اور جو حالت ایمان میں میرے گھر میں پناہ لے اور عام مومنین و مومنات کی خطائیں درگزر فرما

ثنائی	خاقانی
ای از فروغ شمع رخت انور آئینہ دی گشتہ از خیال تو جاں پرور آئینہ	۳۔ ما فتنہ بر توایم و تو فتنہ بر آئینہ مارا نگاہ در تو ترا اندر آئینہ
دیدہ راستان شب صبحی کو گریاں دیدہ اند صبح را چوں چشم گریاں خوں بداماں دیدہ اند	۴۔ شب رواں از صبح صادق کعبۂ جاں دیدہ اند صبح را چوں محرمانِ کعبہ عریاں دیدہ اند

اس کی مثالیں اور بھی ہیں، مگر اس کا استقصا مقصود نہیں، دکھانا صرف یہ ہے کہ ثنائی، خاقانی کا دیوان پیش نظر رکھتا تھا، اور اس کے تتبع یا جواب کی کوشش کرتا تھا، اس نے کہیں کہیں خاقانی پر چوٹ بھی کی ہے، ایک جگہ لکھتا ہے:

حقا کہ بدیں صفا عروسی　　مشاطۂ شیرواں ندیدست

دوسری جگہ رقمطراز ہے:-

انچہ زیں پیش گفت خاقانی　　وصف حال من و بیان منست

از قدیم زماں تہی ست کہ ہست　　در عدم آنکہ ہمقرانِ منست

جس وقت اس نے یہ اشعار لکھے ہوں گے، اس وقت یقیناً خاقانی کا یہ شعر اسکی نظر میں ہوگا

زنہار خائی ہر املیں نترسم از انکہ　　ہنوز در عدم است آنکہ ہمقرانِ منست

ثنائی نے بعض قصائد میں ظہیر فاریابی اور کمال اصفہانی پر بھی تعریض کی ہے، چنانچہ اپنے ممدوح سے خطاب کرتے ہوئے ظہیر فاریابی کے متعلق کہتا ہے:

شاہنشہا گر از رہ کفراں ظہیر گفت[۱]　　بیتی کہ انفعال قزل ارسلاں دہد

من آں نیم کہ برنگے ثنائے تو　　گردم کہ آب روئی دگر سروراں دہد

---

[۱] ظہیر کا مشہور شعر ہے:- شاید کہ بعد خدمت سی سالہ در عراق
نانم ہنوز خسرو مازندراں دہد

گردند جن دانش مرا دیدہ چیں خواں　　نانم خنیں کہ خسرو مازندراں دہد

کمال اصفہانی کی نسبت بھی اس کا رویہ ایک حد تک معاندانہ ہے، ملاحظہ ہو:-

در ہندم و بہ کعت خیالم　　سیبیے ست کہ اصفہاں ندیدست

ایک دوسرے شعر میں صاف صاف کہتا ہے

دانی کہ سحر ساز صفاہاں چہ گفتہ بود　　وقتی کہ داد شش ایں گہر شاہوار دست

دوشیزگان خاطر من بیں کہ غنچہ وار　　بر رو نہادہ اند ز تو شرمسار دست

کہیں کہیں جوش میں آ کر انوری کی برابری کا بھی دعویٰ کر بیٹھتا ہے

شہا بمدح تو ایں نظم را چناں گفتم　　کہ انوری کند اندر برابرم تسلیم

اس بحث سے ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ ثنائی کو ان استادانِ کامل کے مقابلہ میں برتری یا برابری کے دعویٰ کا حق ہے، بلکہ جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ہے، یہ دکھانا مدنظر ہے کہ ثنائی کو فارسی سرمایۂ شعر و ادب پر خاصا عبور تھا،

اس کی علمی استعداد کی دوسری شہادت زحافات کا استعمال ہے، متداول بحروں میں شعر موزوں کرنا چنداں دشوار نہیں، اکثر کم سواد مگر موزوں طبع بھی ان بحور میں طبع آزمائی کر لیتے ہیں، لیکن زحافات کا استعمال علم عروض کی واقفیت کے بغیر بہت مشکل ہے،

ثنائی کے کلام میں زحافات کے استعمال کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں:-

فتاو از پاگاو زمیں ز غایت حمل　　سر بریدہ ز بس بر سر سناں برخاست

عدل تو از طریق مکافات باز داد　　ظلمی کہ از خلائق بر یکدگر رسید

ز فیض رای تو باشد کہ میدہد با خلق　　بچشم اعمی از روشنی نشاں گوہر

غمیں مباش اذیں حضرت ار چہ یکچند سی
جدا فتادی از گردشش سپہر لئیم

اس نے اپنے بعض قصائد میں مشکل زمینوں "آفتاب، گوہر، نرگس" وغیرہ بطور ردیف
استعمال کیے ہیں، اور یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ وہ (ثنائی) اپنے دوسرے
معاصرین کی طرح ان مرحلوں سے بخوبی عہدہ بر آ ہوا ہے،

حقائق بالا کے ہوتے ہوئے تعجب ہوتا ہے جب ہم اس کے بارے میں ملا عبدالقادر
بدایونی جیسے ذمہ دار فاضل کا یہ جملہ پڑھتے ہیں کہ "اگرچہ عامی بیمادہ است وعبارا تش
دفاآں قصیدہ ہای بلند او نمیکند ـــــ اما بہرحال شاعر طبیعت دار است"[1]

بدایونی کے بے لاگ مورخ، سخن سنج ناقد اور زبردست عالم ہونے میں شبہ نہیں
انھوں نے ثنائی کے بارہ میں ایسی رائے کیوں ظاہر کی، بظاہر اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ملا صاحب
کا معیار تنقید بہت بلند تھا اور وہ ثنائی سے اسی عالمانہ اسلوب کی توقع رکھتے تھے، جو خاقانی
وغیرہ سے مخصوص ہے، ورنہ اوپر کی دی گئی مثالوں کے ہوتے ثنائی کو "عامی بیمادہ" کہنا
حقیقت سے دور ہے۔

ثنائی کا تغزل ایران میں اس عہد میں دو دبستان شاعری مقبول تھے، ایک کا بانی
"بابا فغانی" مانا جاتا ہے، جس نے تازہ گوئی (ندرت خیال یا اسلوب) کی بنا ڈالی، دوسرا
"شرف جہاں قزوینی" تھا، جس کی خصوصیت معاملہ بندی یعنی عاشق و معشوق کے روابط
کا بیان ہے، صفوی عہد کے شعراء میں شفائی، محتشم کاشی، علی قلی میلی، ثنائی، غزالی اور وحشی
اس میں شہرت رکھتے ہیں،

ایرانی شعراء جب ہندوستان آئے تو شاعری کا ورثہ ساتھ لائے، اگرچہ انصاف یہ ہے
کہ ہندوستان کی آب و ہوا نے ایرانی سرمائے کی قدر و قیمت بڑھا دی۔

---

[1] منتخب التواریخ ص ۲۰۸ جلد سوم۔

ثنائی مشہدی پہلے دبستان سے تعلق رکھتا ہے، جیسا کہ ہم آگے عرض کریں گے، اس نے اپنی غزلوں
میں خیال بندی اور جدت ادا پر زیادہ زور دیا ہے، اس لئے ہم ثنائی مشہدی کی غزل کی
خصوصیات بیان کرتے ہیں، جو اس کے دیوان کے مطالعہ کے بعد ہماری نظر میں آئیں،

(۱) ان میں پہلی چیز ثنائی کا حسن خیال اور مضمون آفرینی ہے، جس کو تخئیل بھی کہا جا سکتا
ہے، عموماً تخئیل اور محاکات کو شعر کی بنیاد کہا جاتا ہے، لیکن در اصل شاعری بہت کچھ تخئیل
ہی کا کھیل ہے۔۔۔ تخئیل کا سررشتہ فکر سے ملتا ہے، اگر شعر میں فکری عنصر نہ ہو تو وہ عوام کو
تو شاید اپیل کرے، مگر خواص اس سے لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔۔۔ تخئیل یا فکر ہی کی بدولت
شاعر نئی نئی وادیوں کا سراغ لگاتا اور نادر تشبیہات ڈھونڈھ کر لاتا ہے، ثنائی کے چند
شعر جن میں خیال کی خوبی پائی جاتی ہے، نمونہ کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں،

مثلاً یہ کہنا مقصود ہے کہ محبوب کا لب لعل، عاشقوں کی جان لے لیتا ہے، لیکن اسی
کے ساتھ عشق کی بدولت عاشق حیات تازہ پاتا ہے، اس لحاظ سے یہ سودا کچھ گراں نہیں،
اس مضمون کو وہ یوں ادا کرتا ہے، ع

لعلت بفسوں چو جان بدزدد — دل جان دگر ازاں بدزدد

یہ بیان کرنا ہے کہ جو چیز آسانی سے میسر آ جاتی ہے، اس کی انسان کو قدر نہیں ہوتی
اس کے لئے یہ پیرایہ اختیار کرتا ہے،

سنا بو فا روی کہ در طور محبت — جو دار نبود لذت دیدار نباشد

ایک جگہ لکھتا ہے،

مرا بسنگ بلا پا چگونہ در ناید — کہ مست میروم و ردی در قفا دارم

یعنی بعض لوگ دیدہ و دانستہ اپنے لئے مصیبت مول لیتے ہیں، اس کی تمثیل ہیں

کہتا ہے کہ میری مثال اس شخص کی سی ہے، جو ایک طرف تو نشے میں سرشار ہے، دوسری طرف آگے دیکھنے کے بجائے پیچھے دیکھتا ہوا چلتا ہے، ایسا شخص ٹھوکر نہ کھائے گا تو اور کیا ہوگا

شرط عشق است کہ ہم باز بدل باز آید | سخن عشق کہ از دل بزباں می آید

یعنی سچے عاشق کی شان یہ ہے کہ جوں ہی عشق کا راز دل سے زبان تک پہنچے زبان، امانت (راز) صاحب امانت (دل)، کو لوٹا دے،

راز عاشق کہ شود فاش ملامت مکنید | راز در سینہ بلائیست کہ من میدانم

یعنی اگر راز عشق فاش ہو جائے تو برائے خدا مجھے ملامت نہ کرو کیونکہ راز کا سینہ میں محفوظ رہنا جتنی بڑی مصیبت ہے، میں جانتا ہوں، دوسرا اس کو کیا جانے ـــــ،

شور نمکت در جگرم باز نگنجد | در حوصلہ جان و دل ایں راز نگنجد
یک غمزہ نہاں زاں مژہ در کار دلم کن | ہر چند کہ در طاقتم ایں راز نگنجد
بوئی بادر و دیوار کویش ہمہ ورزیدم | کہ بوی آشنائی زاں در و دیوار می آید

بظاہر شعر سادہ ہے، مگر کس قدر نیچرل اور اثر آفریں ہے،

چگونہ عرض تمنا کنم بہ برت | سخن ہنوز نیاوردہ بر زباں خجلم

یعنی اے محبوب! تیرے حضور عرض تمنا کیونکر کروں کہ ابھی دل کی بات زبان تک نہیں آئی، اور خجالت دامنگیر ہو گئی، جب دل میں خیال آنے پر یہ کیفیت ہے، اظہار خیال کرنے پر نہ جانے کیا گذرے، ـــــ

معاملہ بندی کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں،

شوم ہلاک نگاری کہ گاہ عشوہ کند | چناں بغمزہ سخن کش زباں بیاساید

یعنی اس نگار پر جان کیوں نہ دیدوں جو ناز کرتے وقت اپنی چشم "سخن گو" سے

یوں پرسش حال کرتا ہے، کہ زبان کو زحمت کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی، اسی مضمون کو غالب نے اس طرح ادا کیا ہے،

کس منھ سے شکر کیجئے اس لطف خاص کا | پرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں
درگردن جاں دوش حمائل شدہ دیدم | دستی کہ بصد ناز ببوی کمر آورد

یعنی کل رات معشوق نے بڑے ناز سے ہاتھوں کو کمر تک لاکر انگڑائی لی نتیجہ یہ ہوا کہ وہی ہاتھ میری روح کی گردن میں حمائل ہو کر رہ گئے، ـــــ

زبان

سوچنا اور فکر کرنا تمام انسانوں میں مشترک ہے، شاعر کا امتیاز یہ ہے کہ وہ اپنی واردات قلبی کو موزوں اور دلنشین پیرایہ میں بیان کرتا ہے، علامہ شبلی نے ابن رشیق اور دوسرے ناقدین فن کے حوالہ سے یہ فیصلہ کیا ہے کہ "زیادہ تر اہل فن کا یہی مذہب ہے کہ لفظ کو مضمون پر ترجیح ہے، وہ کہتے ہیں کہ مضمون تو سب پیدا کر سکتے ہیں لیکن شاعری کا معیار کمال یہی ہے کہ مضمون کن الفاظ میں ادا کیا گیا ہے، بندش کیسی ہے، حقیقت یہ ہے کہ شاعری یا انشاپردازی کا مدار زیادہ تر الفاظ پر ہی ہے، ـــ (شعر العجم، جلد چہارم)

اس وصف میں بھی ثنائی دوسرے اساتذہ سے پیچھے نہیں ہے، وہ اہل زبان ہے، اسلئے اس کے کلام میں لطف زبان کا ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں، اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں،

غمزہ اشوب دگر آفت و مژگاں خونریز | چشم بد دور ہماں آفت جانست کہ بود
سوی من آں بت طناز نیاید چکنم | گفت می آیم و از ناز نیاید چکنم

یہ پوری غزل لطف زبان کا نمونہ ہے،

جس شعر میں وہ لطف زبان کے ساتھ شوخی اور طنز کا مضمون لاتا ہے، وہاں شعر کی تاثیر اور بڑھ جاتی ہے، مثلاً

گفتی کہ بایں خواری از کیست چنیں حالت
چندیں ہمہ بیرحمی از خوی کہ می آید

یعنی محبوب، عاشق کی حالت دیکھتا ہے اور انجان بن کر پوچھتا ہے "ارے اس بیچارے کا یہ حال کس نے کر دیا؟" وہ جواب دیتا ہے کہ "یہ نہ پوچھو کہ اتنی بیرحمی اور ستم گری کس کا شیوہ ہے تم خود سمجھ سکتے ہو،

کم در آئینہ عرض جمال خویش کہ ہست
کرشمہای بلا چشم شوخ و شنگ ترا[1]

یعنی آئینہ میں اپنے جمال کی نمائش نہ کر کیونکہ میں ڈرتا ہوں کہ تجھے اپنی نظر نہ لگ جائے،

غزل پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس میں تسلسل نہیں ہوتا، اور ہر شعر مضمون کے لحاظ سے دوسرے سے بالکل جدا اور غیر مربوط ہوتا ہے،

ثنائی کے دیوان میں بعض غزلیں مسلسل ملتی ہیں، جن میں سررشتۂ خیال، مطلع سے لیکر مقطع تک ہموار ہے، مثلاً وہ غزلیں جن کے مطلعے حسب ذیل ہیں،

(۱) آں نازنیں کہ دی ز برم خشمگیں برفت — شیریں چو شہد آمد و باز ہر کیں برفت
(۲) ہنوزت گرمی بازار خوبی آتش انگیز است — ہنوزت از کرشمہ پای تا سر آرزو خیز است
(۳) بیا کہ ہر چہ بدل کردہ بجاں بکلی — بر آر تیغ کہ بار دو انجاں بکلی

---

[1] مومن لکھتا ہے:-

تاب نظارہ نہیں آئینہ کیا دیکھنے دوں — اور بنجائیں گے تصویر جو حیراں ہونگے

بزم تیموریہ

مغل سلاطین، مغل شہزادوں اور شہزادیوں کے علمی ذوق اور ان کے دربار کے امراء و شعراء و فضلا کا تذکرہ، جس میں دربار اکبری کے غیر معروف شاعر ثنائی کا بھی ذکر ہے، (زیر طبع) "منیجر"

جدید عربی زبان
پر
ترکی کے اثرات

مترجمہ حافظ محمد نعیم ندوی صدیقی رفیق دار المصنفین

جب دو قوموں کا باہمی اختلاط اور میل جول ہوتا ہے تو جہاں وہ دونوں ایک دوسرے کے تہذیب و تمدن اور عقائد و خیالات سے متاثر ہوتی ہیں، وہیں دونوں کی زبانوں میں بھی لین دین کا عمل شروع ہو جاتا ہے، اور بسا اوقات یہ اثرات اتنے گہرے ہوتے ہیں کہ زبان کی انفرادیت ختم ہو کر اس کی ہیئت ہی بدل جاتی ہے، لیکن ایک زندہ زبان کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ دوسری زبانوں میں ضم ہونے کے بجائے وقت کے تمام انقلابات و تغیرات کا مقابلہ پوری ثبات قدمی کے ساتھ کرتی اور اپنے دامن کو وسیع تر بناتی چلی جاتی ہے، لسانیات کی تاریخ شاہد ہے کہ عربی زبان ہمیشہ ان آزمائشوں میں پوری اتری اور سائنسی اور ٹکنالوجیکل اختراعات و اکتشافات سے الفاظ و اصطلاحات کے ذخیرہ میں جو بھی اضافہ ہوا عربی نے ان سب کو خوش آمدید کہا، اس طرح آج جدید عربی دنیا کی تقریباً ہر ترقی یافتہ علمی اور غیر علمی زبان کے الفاظ سے مالا مال ہے،

سولہویں صدی میں جب ترکوں نے عرب ممالک کو اپنے قلمرو میں شامل کیا تو عرب اور ترک اقوام کے اختلاط نے ایک دوسرے پر بہت گہرے تہذیبی و لسانی اثرات ڈالے بالخصوص شرق اوسط کی زبانوں میں ترکی الفاظ کی آمیزش بہت زیادہ ہو گئی ہے، اور

چونکہ خود ترکی زبان میں فارسی الاصل الفاظ کی کثرت ہے، اس لئے ترکی کے واسطے بہت سے فارسی الفاظ بھی عربی زبان میں دخیل ہو گئے،

ذیل میں سوڈان کے ایک فاضل اہل قلم استاذ فؤ عبد الرحیم کے ایک قابل قدر مقالہ کا ترجمہ ناظرین "معارف" کی ضیافت طبع کے لئے پیش کیا جاتا ہے، جس میں ان عربی الفاظ کو یکجا کر دیا گیا ہے جو یا تو ترکی الاصل ہیں یا اصلاً تو فارسی ہیں لیکن بواسطہ ترکی عربی میں دخیل ہو گئے ہیں، اس فہرست کو مکمل کسی طرح قرار نہیں دیا جا سکتا، علامہ سید سلیمان ندوی کی "لغات جدیدہ" میں اس قبیل کے بہت سے الفاظ ہیں، "معارف" کے گذشتہ شماروں میں اردو زبان کے ترکی عنصر پر کئی گراں قدر مقالات شائع ہو چکے ہیں، اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ عربی پر ترکی کے اثرات کی بھی ایک جھلک دکھا دی جائے، "نعیم ندوی"

گذشتہ ۱۹۶۷ء میں مجھے قاہرہ جانے کا اتفاق ہوا، وہاں کی زبان میں بعض الفاظ جیسے سادہ، طازہ (تازہ) خانہ (گھر) تفتیش، بخشش، پہلوان، ترزی (درزی) اور جنزیر (زنجیر) وغیرہ سن کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کیونکہ یہ الفاظ اسی مفہوم و معنی میں ہماری اردو زبان میں بھی مستعمل ہیں، چنانچہ میرے جذبہ تجسس کو وہ راز معلوم کرنے کی خواہش ہوئی جس کی وجہ سے جدید عربی اور اردو دونوں زبانوں میں یہ الفاظ موجود ہیں، معمولی تلاش و تحقیق کے بعد یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ درحقیقت یہ فارسی الاصل الفاظ ہیں جو اردو زبان میں دخیل ہیں، اور یہی الفاظ ترکی (جو کہ فارسی سے مالا مال ہے) کے واسطہ سے عربی زبان میں داخل ہو گئے،

اسی اثنا میں میرے ایک مصری دوست نے تاریخ لسانیات کا مطالعہ کرنے کے لئے ایک کتاب دی، میں نے کچھ اس سے، کچھ دوسرے ماخذوں سے اور کچھ ذاتی تجربات و مشاہدات سے وہ تمام ترکی الفاظ یکجا کر دیئے، جو مصر، سوڈان، لبنان اور اردن کی زبانوں

میں عام طور سے استعمال کئے جاتے ہیں،

عہد ملوکیہ اور دولت عثمانیہ کے زمانہ میں جدید عربی بالخصوص مصری زبان ترکی سے شدید طور پر متاثر ہوئی، گو مرور وقت کے ساتھ اس شدت میں کمی واقع ہو گئی، پھر بھی عربی زبان میں ترکی الفاظ کی کثیر تعداد نہ صرف عامی، بلکہ علمی و ادبی زبان میں اب بھی باقی ہے مثال کے طور پر شبرت (سرود و موسیقی) بصمہ (چھاپ، طبع) جمرک (چنگی، چنگی گھر) طابور (زین کا تنگیں، وشاویز) طاقم (لڑی، ہوٹ) قنبلۃ (بم، توپ کا گولہ) نیشان (تمغہ، نشان، علامت) وغیرہ،

ذیل میں بترتیب حروف ہجا ایسے الفاظ کی فہرست درج کی جاتی ہے، اس میں پہلے معرب ترکی الفاظ اور ان کی تشریح ہے، پھر جن کا تلفظ دوسرے ملکوں میں مصری بولی سے مختلف ہے، اس کی نشاندہی کی گئی ہے؛ پھر لاطینی رسم الخط میں اصل ترکی کو واضح کیا گیا ہے۔ (جدید ترکی لاطینی حروف میں لکھی جاتی اور اکثر انگریزی زبان کی طرح بولی جاتی ہے)

الف | ابلہ: غیر رشتہ دار کمسن عورت کو مخاطب کرنے کا لفظ اصل ترکی Abla بمعنی بڑی بہن،

اجزجی: دوا فروش، عطار، ترکی Eczacı

اجزخانہ: دواخانہ، ڈسپنسری۔ ترکی Eczane Eczahane

یہ عربی کے کلمہ "اجزاء" اور فارسی کے "خانہ" سے مرکب ہے، ترکی میں اجزاء دوا کے معنی میں آتا ہے،

ادبخانہ: بیت الخلاء، پاخانہ، لیٹرین، جدید ترکی میں یہ لفظ نہیں پایا جاتا،

آفندی: شرفا اور معززین کے نام کے ساتھ بطور "صاحب" کے جدید عربی میں مستعمل ہے، کبھی اس سے شریف آدمی بھی مراد لیتے ہیں، یہ لفظ یونانی الاصل ہے ترکی Efendi

الای: رجمنٹ، فوج کا دستہ۔ ترکی Alay،

انجلیز: انگریز، ترکی Ingiliz یہ دراصل اٹالین لفظ Inglese
سے ترکی میں آیا ہے،

اوربا: براعظم یورپ، ترکی Avrupa اٹالین لفظ Europa سے ترکی
میں دخیل ہوا،

اورطہ: ایک ہزار فوجیوں پر مشتمل دستہ، ترکی ordu بمعنی لشکر "اردو" کا لفظ
اسی سے بنا ہے، اور انگریزی لفظ Horde بمعنی قبیلہ بھی اسی سے نکلا ہے۔

اورمان: قاہرہ میں ایک باغ کا نام۔ ترکی Orman بمعنی جنگل،

اورنیک: سارٹیفکٹ۔ ترکی Ornek بمعنی نمونہ، سوڈان میں اس لفظ کا
بکثرت استعمال ہے،

اوسطی: استاد، باورچی، ڈرائیور، ترکی usta

اوضہ: کمرہ، بالاخانہ، دفتر، ترکی Oda، وہ بھی اس کا تلفظ کرتے ہیں

اونباشی: دس سپاہیوں کا افسر جس کو corporal کہتے ہیں، اسے اباشی
بھی لکھا جاتا ہے، ترکی Onbasi

ب| باش: افسر جیسے باشکاتب (ہیڈ کلرک)، باش مہندس (چیف انجینیر)، ترکی Baş
بمعنی سردار،

باشا: اعلیٰ عہدیدار اور معززین کا خطاب، ترکی Pasa

باشتختہ: تختہ سیاہ، ترکی Pastahta یہ لفظ فارسی پیش تختہ سے ترکی
میں آیا اور پھر اس سے عربی میں دخیل ہوا،

Bahcivan ترکی

بامیا: بھنڈی۔ ترکی
Bahcivan ترکی

بخشونجی: باغبان۔ ترکی

بدروم: باؤلی، تہ خانہ، اس کو بدرون بھی بولا جاتا ہے، ترکی Bodrum
بمعنی تہ خانہ،

برتقال: میٹھا نارنگی، برتقان اور بردقان بھی تلفظ کرتے ہیں، ترکی Port-
akal اصلاً یہ لفظ اٹالین Portogallo سے ترکی میں آیا، اور پھر اس کے
واسطے سے عربی میں مستعمل ہوا،

برجل: پرکار۔ ترکی Pergel

برطمان: مرتبان،

برواز: تصویر یا آئینہ کا چوکھٹا۔ ترکی Pervaz اصلاً اٹالین لفظ ہے،

بروجی: بگلچی، نقارچی، ترکی Boru بمعنی بگل نقارہ،

بشرف: موسیقی، (تھیٹر میں ڈراما شروع ہونے سے قبل جو سرود ہوتا ہے)،
ترکی Pesrev فارسی سے ترکی میں آیا،

بصمہ: انگلیوں کے نشان۔ ترکی Basma بمعنی مہر،

بقسماط: بسکٹ، ترکی Peksimet

بقشیش: بخشش۔ ترکی Bahsis فارسی الاصل ہے،

بک: ایک معزز ترکی لقب، Bey

بقجہ: تھیلی، ترکی Bohca

بکباشی: ایک فوجی عہدہ، ترکی Binbasi یعنی ایک ہزار سپاہیوں کا افسر

یہ ترکی زبان Bin بمعنی ہزار اور Basi بمعنی سردار سے مرکب ہے،

بلطجی: جلاد، بلط قدیم عربی میں بھی تلوار کھینچنے کو کہتے ہیں، ترکی نسبت جی لگنے سے جلاد کے معنی پیدا ہوئے، مجازاً ظالم و جابر شخص پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے، ترکی Bar Ilhchi۔

بلطہ: کلاڑھی۔ ترکی Balta

بلیاہتو: مہر، خاتم شاہی، چھاپ۔ ترکی، Balyaco

بمبہ: بم، توپ کا گولہ، ترکی Bomba اصلاً اٹالین لفظ ہے،

بنج: پاپنج، فارسی الاصل ہے،

بھریز: پرہیز۔ ترکی Pehriz یا Perhiz بمعنی روکنا فارسی الاصل ہے،

بھلوان: بازی گر۔ ترکی Pehlivan بمعنی ہیرو، باکسر فارسی الاصل ہے،

بوظہ: شام و لبنان میں آئس کریم اور مصر میں ایک نشہ آور مشروب کو کہتے ہیں، ترکی Buz بمعنی برف،

بوغاز: آبنائے، دشوار گذار راستہ، دریا کا دہانہ۔ ترکی Bogaz،

بویہ: روغن، وارنش۔ ترکی Boya سوڈان میں اس کا بوھیہ تلفظ کرتے ہیں،

بیادہ: پیادہ، پیدل۔ ترکی (Biyada) فارسی لفظ پیادہ سے ترکی میں آیا،

بیرہ: شراب، بیر، ترکی Bira اٹالین لفظ ہے،

تبہ: ٹیلہ، (شامی زبان میں) ترکی Tepe بمعنی پہاڑ کی چوٹی، چھوٹا پہاڑ،

[ت] تختروان: پالکی، فنس جس پر سوار ہو کر دلھن ..... میکہ سے سسرال آتی ہے، یہ لفظ فارسی الاصل ہے، اور تخت و رواں دو لفظوں سے مرکب ہے،

ترزی: درزی۔ ترکی Terzi

ترسانہ[1]: سلاح خانہ، کارخانہ، جہاز سازی، ترکی Tersane

تنبل: پان۔ ترکی Tembel فارسی الاصل ہے،

تنکہ: کنستر۔ ترکی Teneke

تیزہ: معمر عورت کو مخاطب کرنے کا لفظ۔ ترکی Teyze بمعنی خالہ اور ممانی

[ج] جبخانہ: ذخیرہ۔ ترکی Gebhane

جردل: ڈول۔ ترکی Gerdel

جزدان: چھوٹا منی بیگ، مصری زبان میں جزلان تلفظ کیا جاتا ہے، ترکی، Guzdan اصلاً فارسی لفظ ہے،

جزمہ: بوٹ، جوتا، ترکی، Cizme

جفت: دونالی بندوق۔ ترکی Cilt فارسی لفظ جفت سے بواسطہ ترکی عربی میں دخیل ہوا،

جمرک: چنگی، چنگی خانہ۔ ترکی Gumruk

جنباز: پہلوان۔ نٹ، اسکو جیباز بھی بولتے ہیں، یعنی ورزش بدنی، جمناسٹک کا ماہر۔ ترکی، Cambaz اصلاً یہ فارسی لفظ جانباز ہے، اسی سے ترکی میں جنباز اور عربی میں جمباز ہوا،

جنزیر: زنجیر کا مقلوب۔ ترکی Zencir اور Zincir فارسی الاصل ہے،

[1] علامہ سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ ترسانہ عربی لفظ دار الصناعہ ہے، جو یورپ میں جاکر ڈارسنا ہوگیا اور ترکی سے بعینہ عربی میں چلا آیا، اور ایک جدید لفظ کی طرح مستعمل ہوگیا، "نعیم"

جوال : بورا، بڑا تھیلا، شام و مصر میں اس کا شوال تلفظ کرتے ہیں، ترکی cuval

جی : ماہر کے معنی میں جیسے تعلیمجی (ماہر تعلیم)، عربجی (ماہر عربیات) وغیرہ،

ح

حکمدار : وایسرائے، کمانڈر انچیف، گورنر۔ ترکی Hukumdar

یہ عربی لفظ "حکم" اور فارسی "دار" بمعنی صاحب و مالک سے مرکب ہے،

خ

خازندار : خزانچی۔ ترکی Hame

خانہ : مکان، گھر، ترکی Hane فارسی الاصل ہے،

خردکا : معمولی سامان تجارت، بساطی کی دوکان کی چیزیں، ترکی Hurde فارسی الاصل ہے، بواسطہ ترکی عربی میں آیا،

خواجہ : بجائے "مسٹر" اور "جناب" کے استعمال ہوتا ہے، فارسی سے ترکی میں آیا،

خوجہ : معلم، استاد، ترکی Hoca

د

درابزین : سیڑھی اور زینہ کے دونوں جانب خوبصورت جنگلہ کی قطار، ترکی، Terabzan

دستہ : کسی چیز کے بارہ درجن کا پیک، ترکی Deste فارسی الاصل ہے،

دغری : مستقیم، ترکی Dogru

دمغہ : مہر نشان، بالخصوص سرکاری اور حکومتی اشیا پر لگائی جانے والی مہر۔ ترکی، Damga فارسی لفظ تمغہ سے ترکی میں آیا،

دندرمہ : قلفی، برف کی جمائی ہوئی بالائی۔ ترکی Dondurma بمعنی برف

دونم : ترکی ایکڑ مساوی سوفٹ مربع، عراق اور اردن میں بھی یہ اسی معنی میں عام طور سے مستعمل ہے۔ ترکی Donum

ر

رشتہ : طبی نسخہ۔ ترکی Recete

رنجہ : ایک قسم کی مچھلی۔ ترکی Ringa

روشن : روشندان،

س

سبت : ٹوکرا چھابہ، ترکی Sepet یہ لفظ فارسی سبد سے ترکی میں آیا ہے

سرای : قصر، محل شاہی، ترکی Saray فارسی الاصل بواسطہ ترکی عربی میں داخل ہوا،

سفرجی : باورچی، بیرہ۔ ترکی Sofrachi سفرہ عربی لفظ ہے جس کے معنی دستر خوان کے ہیں، ترکی لفظ نسبت جی کے لاحقہ سے باورچی کے معنی پیدا ہوئے

سلخانہ : مذبح، مسلخ، میونسپلٹی کی طرف سے جانوروں کو ذبح کرنے کے لئے جو مقام متعین ہوتا ہے، صحیح لفظ سلخ خانہ ہے، سلخ کھال کھینچنے کو کہتے ہیں،

سنجہ : سنگین، جو بندوقوں کی نوک پر لگاتے ہیں، ترکی Sungu

سواری : فوجی سوار۔ ترکی Suvari اصلاً فارسی ہے،

ش

شادر : اردنی زبان میں خیمہ اور، مصری میں مخزن کے معنوں میں مستعمل ہے، ترکی Cadir تخت رواں اور چھوٹے مکان پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے،

شاکوش : بڑا ہتھوڑا، فارسی لفظ چاکوش سے ترکی میں شاکوش ہوا، اور پھر بعینہ جدید عربی میں داخل ہو گیا،

شاویش : ہیڈ کانسٹیبل، سارجنٹ۔ ترکی Cavus

شرشف : بالاپوش، پلنگ کی چادر، ترکی Carsaf

شفخانہ : مصر میں یہ لفظ شفاخانہ حیوانات اور سوڈان میں مطلق اسپتال کے لئے

بولا جاتا ہے،

شلتہ: تپی چٹائی، ترکی silte

شنطہ: چرمی بیگ، ترکی canta لبنان میں شنتہ تلفظ کرتے ہیں،

شنکل: مچھلی کے شکار کا کانٹا، کواڑ کی شکنی، ہک، کپڑوں کی کھونٹی، ترکی cengel

شیشہ: حقہ کی چلم، سگریٹ کا پائپ۔ ترکی sise بمعنی شیشہ، فارسی سے آیا ہے،

شوباش: شاباش، مرحبا، شادی کے دن دلھن پر سے جو رقم نچھاور کی جاتی ہے اسے بھی شوباش کہتے ہیں،

ص | صاغ: پورا سکہ، خالص، ترکی Sag

صیوان: سائبان، ترکی Sayenan فارسی الاصل ہے،

ط | طازہ: تازہ نیا، ترکی Taza فارسی سے آیا ہے،

طاقم: سوٹ، جہاز کے کپتان کا یونیفارم، لڑی، ۱۲ عدد کا سٹ یونانی سے یہ لفظ ترکی میں آیا، اور پھر اس کے ذریعہ عربی میں داخل ہوا،

طاولہ: شام اور اُردن میں میز کے معنی میں مستعمل ہے، اور مصر و سوڈان میں ایک قسم کے کھیل کو کہتے ہیں، ترکی Tavela

طنجہ: پستول۔ ترکی، Tabanca

طرشی: اچار ترکی (Tursu) فارسی لفظ ترشی سے آیا ہے،

طلمبہ: نل، کنوئیں سے پانی نکالنے کا پمپ، آگ بجھانے کا انجن، ترکی Tulumba یہ اٹالین لفظ (Tromba) سے ترکی میں آیا، اور پھر اس سے عربی میں مستعمل ہوا،

طوبجی: گولہ انداز، ترکی Topcu

ع | عطشجی: فائرمین، انجن میں کوئلہ جھونکنے والا، ترکی Atesci یہ فارسی لفظ آتش اور ترکی لاحقہ جی بمعنی والا سے مرکب ہے، عربی لفظ عطش سے اسکو کوئی نسبت نہیں

عفارم: آفرین، شاباش۔ ترکی Aferin

عنبر: کارخانہ، مخزن، انبار خانہ، مال خانہ، گودام۔ ترکی، Ambar، غالباً یونانی الاصل ہے،

ف | فابریقہ: فیکٹری، کارخانہ۔ ترکی Fabrika اٹالین لفظ Fabrica سے ترکی میں آیا،

فانلہ: فلالین (کپڑا) ترکی Fanila اٹالین سے ترکی میں داخل ہوا،

فرشاۃ: برش جس سے کپڑے، جوتے یا دانت صاف کرتے ہیں، ترکی Firca

فستان: لہنگا، زنانہ پوشاک، ترکی Fistan

فنجان: چائے یا کافی کی چھوٹی پیالی۔ ترکی Fincan

ق | قائش: استرا تیز کرنے کا چمڑا، ترکی Kayis

قاوون: سردہ۔ خربزہ، ترکی Kavun

قرہ جوز: گڑیا، مورتی، کٹھ پتلی۔ ترکی Karagoz اس کے اصل معنی سیاہ آنکھ کے ہیں،

قرش: ایک ترکی سکہ۔ پیاسٹر۔ ترکی Kurus اصلاً جرمنی Gres-chen ہے، ترکی میں لفظ قروش مفرد ہے لیکن تعریب کرتے وقت اسے جمع قرار دیکر اس کا واحد قرش بنایا گیا،

قزان: تانبہ کا بڑا پتیلہ۔ ترکی Kazan

قزمة: کدالی، ترکی Kazma

قشلاق: فوجیوں کی بارک، اسپتال، ترکی Kisla

قلاوظ: سوراخ کرنے کا آلہ شل برما، رہنمائے جہاز۔ ترکی Kilavuz

قنال[1]: مصنوعی نہر جو کھود کر کسی دریا سے ملائی جاتی ہے، ترکی Kanal اصلاً انگریزی Canal ہے، اس سے ترکی میں اور پھر عربی میں دخیل ہوا،

قنبلة: بم، توپ کا گولہ۔ ترکی Kumbra

قورمہ: محفوظ کیا ہوا گوشت، ترکی Kavarma،

(ک) کار: غلہ سے لدی ہوئی کشتی، پیشہ، عہدہ، ترکی Kar فارسی الاصل ہے،

کتب خانہ: کتب خانہ، مکتبہ، لائبریری، ترکی Kutuphane یہ عربی کتب اور فارسی خانہ سے مرکب ہے،

کرباج: چرمی کوڑا۔ ترکی Kirbac

کردان: مالا، ہار، کنٹھی۔ ترکی Gerdan lik

کریک: پھاوڑا، کدالی، ترکی Kurek

کستنا: شاہ بلوط کی لکڑی یا درخت، ترکی Kestane،

کشتبان: انگشتانہ جو عموماً درزی سوئی سے حفاظت کی خاطر انگلی میں پہنتے ہیں، یہ اصلاً

[1] سید صاحب علیہ الرحمہ لکھتے ہیں کہ قدیم زبان میں اس کے معنی یہ تھے کہ چند کوئیں قریب ملا کر اس طرح کھودے جائیں کہ کل مل کر ان کی ایک تالاب کی شکل بنجائے، اس خاص لفظ کے مستعمل ہونے کی وجہ یہ ہوئی کہ نہر کو انگریزی میں کنال کہتے ہیں، اہل مصر اس کو قنال کہنے لگے، "نعیم"

فارسی لفظ انگشت بان بمعنی انگلی کی حفاظت کرنے والا سے ترکی میں آیا ہے

کشک: خیمہ، گنبد دار محل، ترکی Kosk

کفتہ: کوفتہ (گوشت کا)، ترکی Kofte اصلاً فارسی ہے، بواسطہ ترکی عربی میں دخیل ہوا

کبشہ: مقدار ایک کفدست، مٹھی بھر ترکی Kepse

کفگیر: کفگیر، ترکی Kevgir فارسی الاصل ہے،

کلیم: فرش، قالیچہ، کمل، ترکی Kilim اصلاً فارسی،

کمنجة: سارنگی۔ ترکی Kemence

کندرہ: انگریزی جوتا، بوٹ۔ ترکی Kundura

کہنہ: قدیم پرانا، اوٹ آف ڈیٹ، ترکی Kohne فارسی الاصل ہے،

کوبری: پل خصوصاً آہنی پل۔ ترکی Kopru

لغم: سرنگ جس میں بارود بھر کر کسی چیز کو اڑاتے ہیں، ترکی Lagim اصلاً یونانی ہے، بواسطہ ترکی عربی زبان میں دخیل ہوا،

لوکاندہ: ہوٹل، ریسٹوران، ترکی Lokanta اصلاً اٹالین لفظ ہے،

ماسورہ: پانی کی نالی، سگریٹ کا پائپ، ترکی Masura

ماشة: لوہاروں کی سنسی جس سے گرم لوہا پکڑتے ہیں، چمٹا جس سے انگاروں کو پکڑا جاتا ہے، ترکی Masa اصلاً فارسی ہے،

ماهية: تنخواہ، مشاہرہ، مصر میں اس کی جمع ماہیات اور سوڈان میں مواہی تلفظ کیجاتی ہے، اغلب ہے کہ یہ فارسی لفظ ماہ بمعنی مہینہ سے ترکی میں آیا ہے،

سکران: نشہ میں چور، مست، ترکی Mastur

منا ورۃ: فوجی نقل و حرکت، ترکی Manevara یہ اٹیالین لفظ Manovar سے ترکی میں آیا اور اس کی وساطت سے عربی میں دخیل ہے،

موضۃ: فیشن، وضع، ترکی Moda اصلاً اٹیالین ہے،

میدالیۃ: تمغہ۔ میڈل، ترکی Medalya اصلاً اٹیالین لفظ Medaglia ہے،

ن نشان: علامت، نشان، ترکی Nisan

نمرۃ: نمبر، عدد، شمار، ترکی Numara یہ اصل میں اٹیالین لفظ Numero سے ترکی میں دخیل ہوا ہے،

نیشان: تمغہ، ترکی Nisan فارسی الاصل ہے،

و وابور: اسٹیمر، ریل، اسٹیم انجن، ترکی Vapur اصلاً فرنچ لفظ Vapeur ہے، اس سے ترکی میں اور پھر عربی میں آیا،

ونش: بھاری بوجھ اٹھانے کی مشین۔ ترکی Vinc اصلاً انگریزی لفظ Winch ہے،

ی یاقتہ: گلے کا کالر جو کپڑوں کو میل سے بچانے کے لئے لگاتے ہیں، ترکی Yaka

یاور: شاہی محافظ، ایڈیکانگ، ایک شاہی عہدہ اعلیٰ، ترکی، Yaver

یای: اسپرنگ، لوچدار کمانی، ترکی Yay

یخنی: یخنی (پلاؤ کی یخنی)، ترکی Yahni

یکی: جدید، نیا۔ ترکی، Yeni

یمکخانہ: مطعم، ڈائننگ روم، یہ ترکی Yemek اور فارسی خانہ سے مرکب ہے،

یفطہ: اشتہار، سائن بورڈ، ترکی، Yafta

یوزباشی: کپتان، فوج یا پولیس، ترکی Yuzbasi یعنی سو آدمیوں کا افسر، یہ لفظ Yuz یعنی سو اور Basi یعنی سردار سے مرکب ہے،

مترجم:۔ فاضل مقالہ نگار کی دی ہوئی مذکورۂ بالا فہرست کے علاوہ اس قسم کے چند اور الفاظ بھی درج کئے جاتے ہیں،

جزمجی، بوٹ ساز،

جزلک عینک،

جلاجی جعلساز

معروف سر، سردار، افسر (فارسی بواسطہ ترکی)،

شلتہ، پتلی چٹائی،

شنک، آتش بازی

عشی، باورچی (لفظ ترکی نسبت عربی)

فارزلا، برِ اعظم،

قباق، جنگی جہاز، پال

قائق، کشتی،

قماش، کپڑا،

قناق، جائے قیام، عہدہ داروں کی جائے قیام (کوارٹر)

قنجہ، چھوٹی کشتی، ڈونگی،

قنطرمہ، ایک قسم کی لگام،

قورس، بندوق کی گولی،

کلبش، ہتھ کڑی، ہاتھ کی زنجیر،

مودۃ، فیشن، وضع،

ورق تمغہ، پوسٹ اسٹامپ (تمغہ دمہر)

ورمل، ادائے تشکر کے موقع پر بولتے ہیں،

تشکریہ، تھینک،

یافتہ، یافطہ، سائن بورڈ، کاغذ، اشتہار،

یداک، ٹٹو،

یلطقان، خنجر، پیش قبض،

یکن، بھانجہ، بھتیجہ،

یکی، جدید۔ نیا،

یلک، ویسٹکوٹ، صدری،

یکیشیری، ترکوں کی ایک قدیم فوج کا نام، جس کو ینگچری فوج کہتے ہیں، نگہبان، سفارت خانہ، کسی سفیر کا آرڈلی،

شاہ حسین لاہوری

کا

ایک غیر معروف رسالہ تہنیہ

از جناب محمد اقبال صاحب مجددی۔ لاہور

شاہ حسین بن شیخ عثمان لاہوری جو اپنے دور کے ممتاز صوفیہ میں تھے ۹۴۵ھ میں لاہور میں پیدا ہوئے، سالِ ولادت "صبح صادق براوج فقر دمید" سے برآمد ہوتا ہے،

دس سال کی عمر میں شیخ ابا بکر حافظ لاہور کی خدمت میں قرآن کریم پڑھنے کے لئے گئے:۔

بود کوچک حسین آں ہنگام　　عمر دہ سالہ داشت آں ایام

بود بو بکر حافظ استادش　　کہ ز قرآں سبق ہمی دادش[1]

۹۵۵ھ یعنی دس سال کی عمر میں شیخ بہلول دریائی کی بیعت کی، شاہ حسین کے والد شیخ عثمان پنجاب میں ڈھدہ کے عرف[2] سے مشہور تھے، معارج الولایت میں ہے:۔

"در عرف ڈھدہ بود و ڈھدہ صنفی از جولاہگان است"[3]

---

[1] حقیقت الفقراء قلمی ورق ۴ الف ذخیرۂ شیرانی کتابخانہ دانش گاہ پنجاب [2] شیخ بہلول دریائی متوفی ۹۸۳ھ مرید و خلیفہ شاہ لطیف میری قادری وے مرید و خلیفہ شیخ جمال اللہ وے شیخ عبد القادر جیلانی (حقیقت الفقراء قلمی ورق ۳۵ ب بعد)

[3] معارج الولایت قلمی ورق ۵۱۹۔ ۲ مولفہ غلام معین الدین عبد اللہ خویشگی قصوری بسال ۱۰۹۴ھ مکتوبہ ۱۱۱۱ھ، ذخیرۂ پروفیسر سراج الدین آذر کتب خانہ دانش گاہ پنجاب۔

حقیقت الفقراء کا مصنف ایک غالی وحدۃ الوجودی تھا، اس نے جولاہ کو الہ بنانے کی ناکام کوشش کی ہے[1]،

شاہ حسین کی رندمشربی کے قصے تذکرہ نویسوں نے مزے لے لے کر بیان کئے ہیں، لیکن قصے یا تو غلط ہیں یا بعد میں ان سے تائب ہو گئے تھے، صاحب معارج الولایت کا بیان ہے

"دگویند وقتی کہ وفات او نزدیک رسید امور نامشروعہ را ترک نمودہ و بنماز و روزہ مشغول گشت، گفتند دریں حکمت چیست؟ فرمود بزمینی میروم کہ آں را ورزیدہ و بساکنان آں موضع معرفت حاصل نگردانیدہ نمی دانم احوال من چہ خواہد شد، دریں حال برحمت حق پیوست رحمۃ اللہ علیہ"[2]

صاحب حقیقت الفقراء کی روایت کے مطابق شاہ حسین لاہوری کا انتقال جمادی الثانی ۱۰۰۸ھ میں ہوا:۔

چوں شدش باحق از وفات وصال　　بود افزوں بر الف ہشتم سال

بود ہم روز جمعہ نورانی　　سلخ ماہ جمادی الثانی

شب ماہ رجب زد در زماں　　شد حسین از وصال حق شاداں

سال تاریخش از حساب جمل　　گفت ہاتف کہ "مست عشق ازل"

عقل کل نیز بر فشاندہ دو دست　　باز گفت "از مئی محبت مست"[3] ۱۰۰۸ھ

مفتاح العارفین کے مصنف نے شاہ حسین کا سال وفات ۱۰۱۳ھ لکھا ہے،

"سوئم شوال سنہ ہزار و سیزدہ رحلت (کرد) و در لاہور مدفون است"[4]

---

[1] حقیقت الفقراء قلمی ورق ۳۶۔ ۱۔ ب [2] معارج الولایت قلمی نسخہ مذکورہ ورق ۵۱۹ ب [3] حقیقت الفقراء قلمی ورق ۱۰۲۔ ۱ [4] مفتاح العارفین قلمی مولفہ عبد الفتاح بن محمد نعمان سال تالیف بعد ۱۰۹۶ھ

لیکن عموماً تذکرہ نویسوں نے اول الذکر سال (سنہ ھ) وفات ہی لکھا ہے،

شاہ حسین لاہوری کے سوانح نگاروں پر ایک نظر شاہ حسین کے حالات پر قدیم ترین کتاب بہاریہ کا ذکر ملتا ہے، لیکن ہنوز یہ کتاب ناپید ہے،

حقیقت الفقراء سنہ ھ میں شیخ محمود معروف بہ محمد پیر نے شاہ حسین کے خوارق و کرامات پر ایک منظوم کتاب حقیقت الفقراء کے نام سے لکھی جو تقریباً تمام متاخر تذکرہ نویسوں کا ماخذ ہے،

لیکن حقیقت الفقراء کا "حقیقت" اور "فقر" دونوں سے کوئی تعلق نہیں ہے، اس کا مصنف ایک غالی وحدت الوجودی تھا، اس نے شاہ حسین کے بارے میں جو افسانے لوگوں کی زبانی سنے وہ بلا تامل اور بغیر غور کے نقل کر دیئے، جس سے یہ کتاب رطب و یابس کا مجموعہ بن کر رہ گئی ہے اس کے مطالعہ سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ شاہ حسین لاہوری ایک فاسق و فاجر انسان تھے۔

معارج الولایت مولفہ غلام معین الدین عبد اللہ خویشگی بسال سنہ ۱۰۹۴ھ، اگرچہ اس کے مصنف نے شاہ حسین لاہوری کے حالات کے سلسلہ میں اپنے ماخذ کی وضاحت نہیں کی ہے، لیکن اس کی نقل کردہ حکایات بھی وہی ہیں جو حقیقت الفقراء میں درج ہیں، مگر شاہ حسین لاہوری کا شمار سہروردیہ سلسلہ کے صوفیہ میں کیا ہے، اور شاہ حسین اور مادھو کے معاشقے کی داستان نہیں نقل کی ہے،

مفتاح العارفین بعد سنہ ۱۰۹۶ھ مولفہ عبد الفتاح بن محمد نعمان۔

اس کے مصنف نے بھی شاہ حسین سے منسوب مذکورہ حکایات پر اکتفا کیا ہے، مگر شاہ حسین اور مادھو کے معاشقے کی داستان کو انھوں نے بھی نظر انداز کر دیا ہے،

خزینۃ الاصفیاء مولفہ مفتی غلام سرور لاہوری سنہ ۱۲۸۰ھ کا بھی حقیقت الفقراء ہی ماخذ ہے، شاہ حسین کے شیوخ شاہ لطیف بری اور شیخ بہلول دریائی کے متعلق لکھا ہے:-

"صاحب معارج الولایت شیخ بہلول و شاہ لطیف را از مشائخ سہروردیہ شمار نمودہ است"[1]

[1] خزینۃ الاصفیاء جلد اول ص ۱۳۱ مطبوعہ مطبع ثمر ہند لکھنؤ سنہ ۱۸۷۳ء،

جس کی تصدیق معارج الولایت کے پیش نظر خطی نسخۂ آذر سے نہیں ہو سکی،

دوسرے متاخر مورخین لاہور نے بھی حقیقت الفقراء میں مندرج حکایات کے اعادہ پر اکتفا کیا ہے، شاہ حسین لاہوری کی تصانیف میں اب تک صرف کافیاں ہی منظر عام پر آئی ہیں، اور تذکرہ نویسوں نے ان کا ذکر کیا ہے[1]، کافیوں کے قدیم و جدید ایڈیشن بھی تحریف سے خالی نہیں ہیں،

خوش قسمتی سے شاہ حسین کا تصوف کا ایک رسالہ تہنیتہ دستیاب ہو گیا ہے، یہ رسالہ اس کی جانب منسوب قصوں کا ناقابل تردید ثبوت ہے، اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ حسین حافظ قرآن، ذی علم اور راسخ العقیدہ مسلمان تھے، تذکرہ نویسوں نے جن فرضی حکایات کا ان سے انتساب کیا ہے، وہ محض افسانہ ہیں،

رسالہ تہنیتہ کا فارسی متن محققین کی خدمت میں اس لئے پیش کیا جا رہا ہے کہ وہ اس پر نقد و تبصرہ فرما کر صحیح نتائج قارئین کے سامنے لا سکیں، رسالہ پر توضیحی حواشی رسالہ کے کتابی صورت میں شائع ہونے پر شامل کئے جائیں گے،

راقم الحروف کو رسالہ تہنیتہ کا یہ خطی نسخہ مولانا سید شریف احمد شرافت نوشاہی مد ظلہ العالی ساہن پال (گجرات) کے ذاتی کتب خانہ سے ملا،

رسالہ تہنیت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ الذی ارسل رسولہ بالھدی والصلوٰۃ علی محمد المجتبیٰ وعلی آلہ کہ در

[1] صاحب مفتاح العارفین نے شاہ حسین کے متعلق یہ اشعار نقل کئے ہیں،
"شخصی پرسید تو کیستی گفت نہ مسلمان نہ کافر نہ مقیم نہ مسافر الا من کما کان چنانکہ در زبان ہندی گفت
فقیر حسین جولاہا، ناں مول نہ لاہا ناگھر باری ناں مسافر، جو آہا سو آہا"
(مفتاح العارفین قلمی نسخۂ شیرانی در ضمن حالات شاہ حسین)

ایشان قل لا اسالکم علیہ اجرا الا المودۃ فی القربیٰ رسیدہ واصحابہ کہ تخلقوا باخلاق اللہ
بکمال رسیدہ ورزیدہ وسائر تابعین اجمعین بعد ان میگوید حسین لاہوری کہ بخاطر رسید کہ چند نوع
در ہفت فصل جمع کنیم تا دوستان خدا برنگ سہولت مطالعہ فرمایند وایں را مسمی تہنیۃ کردم تا ہمہ کس
را مبارک گردد، **فصل اول** در ترک اقربا ودوستی ایشان بدانکہ طالب را باید کہ از اقربا خود تارک
باشد بریں معنی کہ اگر ایشان غیر از محبت وداد مبتلا سازند وتلقین ترک نمایند وباعث بغیریت باشند
واغشتہ بنجاست غیر سازند ویقطعون ما امر اللہ بہ ان یوصل پس ازیں سبب او را لازم است
کہ از خود ترک گیرد واطاعت ایشان نپذیرد، قولہ تعالیٰ وان جاھداک علی ان تشرک بی ما لیس
لک بہ علم فلا تطعھما، واگر درپے مزاحمت باشند پس مبتدی را باید کہ ایشان را مانع آید،
بلکہ مدعی باشد، قولہ تعالیٰ اف لکم ولما تعبدون من دون اللہ الخ وعلیٰ ھذا القیاس در غیر آں
وجائے دیگر گفتہ واذ قال ابراھیم لابیہ آزر اتتخذ اصناما آلھۃ انی اراک وقومک
فی ضلال مبین، واگر ایشان ساعی باشند کہ در مکتب عشق قیام نماید پس خدمت ایشان باشد و
از اطاعت ابا نیارد، قولہ تعالیٰ اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم فان تنازعتم
فی شیء فردوہ الی اللہ والرسول ان کنتم تؤمنون باللہ والیوم الآخر ذلک خیر
واحسن تاویلا، ونیز جائے دیگر گفتہ، قولہ تعالیٰ، وقضی ربک ان لا تعبدوا الا ایاہ وبالوالدین
احسانا، کہ نتیجہ باید ونہال عمر او ثمرہ برخورداری بارور گردد **فصل دویم** در طلب مال وترک
آں بدانکہ طالب را یکبارگی ترک از مال خوب نیست ازینجہت کہ ایں اب خود را نام با عزیز یاد نمود
پس دوستی بر و ثواب ست بقدر ما یحتاج اما نہ چنداں کہ مبتدی را از راہ باز دارد و دل بستہ
گرداند، ہمچو مگس در دیگر حوائج بسیار بر و مترتب ست و بمنزلہ میانجی ست و ترک بریں صورت گیرد
کہ سود و زیاں او یکساں داند قولہ تعالیٰ، لکیلا تاسوا علی ما فاتکم ولا تفرحوا بما آتاکم

وبقدریکہ احتیاج بقوت باشد بازو حاصل کند قولہ تعالیٰ ھو الذی جعل لکم اللیل والنھار
لتسکنوا فیہ ولتبتغوا من فضلہ وجائے دیگر گفتہ وابتغوا من فضل اللہ تا آبروئے
اولیا زوال باشد واگر میسر نتواند کرد بسبب ذکر فقر وفاقہ پیش گیرد وچیزی نطلبد از مردم بہ ننگ
استغنا نہ بالحاح قولہ تعالیٰ لا یسئلون الناس الحافا، چوں توشہ فقیر برگزیست پس آں ہادی را
طلب چرا کہ بے ایں نمی شود واللہ الہادی۔ **فصل سوم** در گرفتن ہادی بدانکہ طالب را باید کہ طلب ہادی کند
چوں در قرآن مذکور ست یا ایھا الذین آمنوا اتقوا اللہ وابتغوا الیہ الوسیلۃ
وجائے دیگر نیز مذکور است فاسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون وہادی یافتہ نمی شود
مگر بطلب راسخ پس مبتدی را باید کہ ہیچ احدی را از خدائے یاد بد اعتقاد نباشد دوام محبت نہد
چنانکہ صیام دام می نہد باشد کہ یک روز ہما بدام افتد ؎

خورش دہ بگنجشک وکبک وحمام — کہ یک روزت افتد ہمائے بدام

و بہر کہ اعتقاد او درست آید ہموں را مقتدیٰ سازد چونکہ دل منبع الٰہی است و امکان نیست
کہ در وسوسہ شیطانی راہ یابد چونکہ روش درویش دوستی خداست و رسوم آداب یاد گیرد چنانکہ
ہادی خود را بنام نخواند و در خدمت او قیام نماید و خود را بد و قیاس نکند چونکہ او دریاست و
ایں حقیر پیش حقیر را بدریاچہ مناسبت ست جائیکہ دریاست و ایں حقیر کتب انواع آداب
از رسائل بزرگان چنانچہ بکبہ وغیرہ مطالعہ کند و در عمل آرد کہ نتیجہ کلی ست واز مدعیان محبت آں
عزیز بگسلاند کہ بکار او خواہد آمد ھو الطالب **فصل چہارم** در بیان فوائد کہ بداں کہ اگر طالب مطلوب را کہ او در راہ بری سرگشت
پس حاجت تقاضا نماند کہ از و چیزے پرسد باد رنگ اعتراض پیش آید کہ ایں بے نصیبی ست چنانچہ قصہ خضر وموسیٰ واگر مطلوب
را یافت کہ او بلباس درویشی ملبوس است واز علم ہدایت عاری پس او را ہمیں محبت کافیست اگرچہ ارادہ او را حاصل نخواہد بود
تا دو دو ہا ابا لبطنہ الجود بصورت المطلوب فرشتہ پیدا کند از محبت او تا ہم او رہبری کند واگر ایں طالب فنون راہ روش بزرگان

کتب مطالعہ کند و یا از کسے آموزد و مطلب طالب را منع نکند و از پختہ بر کم و راہ حوالہ شود کہ جمع غیر تفرقہ قرار نگیرد، کہ مقصود خت بمنزل رسانیدن ست و ہو البلیغ، **فصل پنجم** بدانکہ مرشد طالب را با افعال او ملاحظہ نماید و جامۂ دل آں را از نجاست غیریت پاک سازد چنانکہ اگر کافر باشد او را شریعت و قواعد اسلام آموزد، و اگر فاسق باشد بآب تعریہ مطہر کند از دوازدہ کبائر باز آرد و اکتفا نگیرد و تملق و تعلق او نکند چنانکہ آوردہ اند کثرۃ التواضع علامۃ النفاق و از جہت او معلوم نہ کند و چوں لطیفہ حاصل آید یکایک آں طالب را شاغل بذکر جلی بکند، نخستیں از جام محبت مجان خاص جرعہ بخشند کہ منظور گردد چوں او بخدمت پسندیدہ شود او را بکلمہ طیب مشغول سازد قولہ تعالیٰ الیہ یصعد الکلم الطیب والعمل الصالح یرفعہ تا آیۃ او انجلا گردد و قرار گیرد قولہ تعالیٰ الا بذکر اللہ تطمئن القلوب و بعد ازاں اشارت بخفی کند کہ نتیجہ فاذکرونی اذکرکم با و متواصل گردد و شورش عشق در جان او شعلہ گیرد قولہ تعالیٰ یحبہم و یحبونہ کہ از آتش سوزان داستخوان او چوں ہیزم و دل پر آب کباب شود ہرگاہ کہ طالب ایں منزل طے کرد و لوح عشق در مکتب محبت بتمام نماید و ہو المجب، **فصل ششم** وجود انسان بطریق زمین صالح است و عشق مانند تخم درخت میوہ دار پس چوں آں تخم در زمین گردد و آب محبت پرورش یابد و نمو او محبت پیدا کند آخر الامر آں تخم درخت میوہ دار بارور گردد و آں سہ مراتب ست مرتبہ اول آنکہ و نشا او نیت است کہ الاعمال بالنیات و نشا نیت خطرہ و وسوسہ و اصل ہر شے وسوسہ است پس چوں شی موسوس قرار گیرد و خطرہ گردد و چوں قرار گیرد نیست حاصل آید، چوں نیت ترقی در خطرہ شد آفات آید و آفات آنست کہ ہریک را برادر شفیق داند اندر دین کہ انما المومنون اخوۃ و نیز مذکور است فاخوانکم فی اللہ و در رنج و راحت او بر خود لازم داند و در وقت حاجت، حاجت او را بر حاجت خود مقدم دارد و دوستی دوستاں محبوب را پوشیدہ در محبت قیام نماید و مرتبہ محبت آنست کہ محبوب را بمتعلقان او دوست دارد و شیوہ وداد ایشاں بجا آرد، کہ کلب الحبیب حبیب، مصرعہ

ہوا خواہان کویش را چو جان خویشتن دارم

تا آنکہ غربت ہمنان او گردد بعد ازاں خلت حاصل آید خلت آنست کہ دیگرے را جز دوست و دل جا ندہد چنانکہ فرمودہ اند لو کنت متخذا خلیلا لاتخذت ابا بکر خلیلا ولکن خلیل اللہ و چوں عقدہ یگانگی راسخ گشت و وصول یافت بعدہ باید دانست کہ ہر کہ در رابطہ دنیا بر او یہ خیال پا نہادہ ہر یک را اندائے عشق شامل گشتہ پس احدی از خلل عشق خالی نیست ہر کہ باشد عارف آخر الامر بچیز یکہ خلت داشتہ باشد ہموں شی محو گردد چنانکہ فرمودہ اند الناس علیٰ دین خلیلہ، حکایت نیز گفتہ و در سکرات موت وصیت کرد کہ بعد از وفات دو کوزہ دنانیر در قبرش دفن کنید چوں زر بسیار بود و حیثیش بجا آوردند پس از چند مدت پسران او مفلس شدند خواستند کہ آں مبلغ را از قبرش برارند دفنہ قبرش را کافتند و آں مال پدر را ندیدند حیران بودند چہ بینند کہ ہمہ دینارہا بتمثیل ملک ماہی بوجود او چسپیدہ خواستند کہ از وجودش جدا سازند، چندانکہ سعی بلیغ نمودند جدا نہ شد از بس حرص چناں مصلحت دیدند کہ آں شخص را بسوزند و زرا از و حاصل کنند، چوں سوختند ملاحظہ نمودند کہ تمام زر گشتہ ہمہ را متصرف شدند او چوں ہموں ذات بود رخت ہماں ذات شد بعد ازاں جانب من سعی نماید بدانکہ من عبارت ازآنست کہ از ازل تا ابد خبر نداشتہ باشد ہر نامی کہ منسوب کنند نامیدہ شود و کنہ ایں سر معلوم نخواہی کرد ہرگز و تیکہ مردود باشی یا مستغرق یا ہمیں معاملہ مخلوق یا محدوث واللہ اعلم بالصواب،

باتمام رسید نسخہ متبرکہ رسالہ تہنیت مصنفہ قدوۃ الواصلین حضرت شیخ حسین قادری لاہوری بدستخط فقیر شریف احمد عفی عنہ قادری نوشاہی متوطن ساہنپال شریف ضلع گجرات بتاریخ بست ہفتم شعبان المبارک ۱۳۴۷ھ یکہزار سہ صد چہل ہفت ہجری المقدس،

بزم صوفیہ

مصنفہ سید صباح الدین عبد الرحمٰن (زیر طبع)

آدابُ الرسائل
کا
تنقیدی مطالعہ

از ڈاکٹر احتشام احمد ندوی، ایم اے، پی ایچ، ڈی، لکچرر شعبہ عربی ونکیٹیشور یونیورسٹی اندھرا پردیش

عبد الرحمٰن بن عیسیٰ ہمدانی الکاتب (متوفی ۳۲۰ھ) کی تصنیف آداب الرسائل نثر کی تنقید پر ایک اہم تصنیف ہے، ابن قتیبہ کے بعد یہ پہلا ناقد ہے، جس نے نثر کے نقد کی جانب توجہ کی، اور اس موضوع پر اپنے گراں قدر افکار پیش کئے، پہلی مرتبہ مطبع الآباء الیسوعیین بیروت نے ۱۸۸۵ء میں اس کتاب کو "الالفاظ الکتابیۃ" کے نام سے شائع کیا تھا، اس کا ایک مخطوطہ کتبخانہ آصفیہ حیدرآباد دکن میں موجود ہے، جس کا نمبر ۱۸۱۳ ہے، اس مخطوطہ کا نام "الالفاظ الکتابیۃ" کے بجائے "آداب الرسائل" ہے، کتاب کے موضوع کے لحاظ آداب الرسائل زیادہ مناسب نام معلوم ہوتا ہے، اس لئے میں نے اسی کو ترجیح دی، رہ گیا ادبی الفاظ کا ذکر تو اس دور میں نثر کی تنقید پر جتنی تصنیفات کی گئیں ان سب میں ناقد یہ بتانا اپنا فرض سمجھتا تھا کہ کون کون سے الفاظ ادبی ہیں اور ان کو کن مواقع پر استعمال کرنا چاہئے، وہ ان کے مراتب اور استعمال کا طریقہ بھی بیان کرتا تھا، مشرقی تنقید نگاروں کے پیش نظر عام قارئین کی مشکلات نہ ہوتی تھیں، اس لئے وہ لکھنے والوں کو براہ راست مخاطب کرتے تھے، پرانا انداز فکر یہ ہے کہ اگر کسی اوسط درجہ کی تعلیم و صلاحیت رکھنے والے کو شعر و ادب

کے قواعد و اصول ذہن نشین کرا دیئے جائیں، تو وہ بھی نظم یا نثر لکھ سکتا ہے، یہ طرز فکر قدیم دور میں یورپ میں بھی رائج تھا، اس کو قانونی تنقید (Legislative Criticism) کہا جاتا ہے، اس کے برعکس جدید عربی تنقید کا رجحان یہ ہے کہ تنقید فنکار کا نہیں بلکہ اس کے ناظرین کی تعلیم و تربیت کا ذریعہ ہے، اور اس کے مخاطب عام قارئین ہیں نہ کہ فنکار، اس بنیادی فرق کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے، ورنہ آداب الرسائل جیسی تنقیدی کتابوں کے بارے میں غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے، ہمدانی نے اس کتاب میں عمدہ عبارت لکھنے کے طریقے سکھائے ہیں، اور اچھی نثر کے بارے میں وقیع خیالات کا اظہار کیا ہے، "رسالہ" اس دور کی ایک اصطلاح ہے، اس کے لفظی معنی پیغام کے ہیں مگر ادبی اصطلاح کی حیثیت سے اب اس کا استعمال عام ہے،

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آداب الرسائل میں مصنف نے قتیبہ کی ادب الکاتب کو پیش نظر رکھا ہے، ادب الکاتب میں ادبی الفاظ کو جمع کیا گیا ہے، آغاز میں ایک تنقیدی مقدمہ ہے، جس میں مصنف نے کتاب کے مقاصد پر روشنی ڈالی ہے، وہ لکھتا ہے:۔

"میں نے اس کتاب میں ہر طبقے سے متعلق وہ الفاظ استعمال کئے ہیں جو رسائل و دواوین میں مستعمل ہیں، اور جن کی فصاحت شبہہ سے بالاتر ہے، ان میں زبان کے وہ عیوب نہیں جو لہجہ سے متعلق ہیں، اور نہ وہ مصنوعی ادیبوں اور متکلموں کے یہاں ملتی ہیں، یہ الفاظ ہر فن سے متعلق ہیں اور فہم سے قریب ترین، یہ رسائل سے بھی ماخوذ ہیں اور عام لوگوں کی گفتگو سے بھی، دواوین دفاتر، علماء کی تصانیف اور رؤسا کی محفلوں سے بھی، ان کے جمع کرنے کے سلسلہ میں استفادہ کیا گیا ہے، اس لئے الفاظ کو اس کے محل کی مناسبت سے بیان کیا گیا ہے، یہ لفظان میں دوسرے لفظ کی مناسبت کو ظاہر کرتا ہے"

اس دور میں عام ناقدوں کا رجحان یہ تھا کہ جو گذشتہ شاعر و ادیب گذرے ہیں، زبان و بیان میں ان کی تقلید کی جائے، ہمدانی لکھتے ہیں کہ ادیب، شاعر، خطیب کے لئے متقدمین کی تقلید

ضروری ہے، انہیں دیکھنا چاہئے، کہ متقدمین نے کس طرح نئے معنی اختراع کئے اور متاخرین کے لئے کچھ
باقی نہیں چھوڑا، اگر نئے ادیبوں میں سے کسی نے متقدمین کے اختراع کردہ معانی سے کوئی معنی اخذ کیا، تو یہ
واضح سرقہ ہے، البتہ اگر وہ معنی تو دوسروں سے لیتا ہے، مگر اس کو نیا قالب عطا کرتا ہے تو اس کا اسکو
حق ہے، مگر جس کے پاس الفاظ کا ذخیرہ وافر نہ ہو، وہ اس سے قاصر رہے گا، اور اپنے فن میں ناقص ہوگا
ان کے یہاں خامیوں کا ہونا ضروری ہے، لفظ معنی کی زینت ہے اور معنی لفظ کا ستون ہے، اگر معنی بلند
ہو تو سخیف الفاظ میں اس کا حسن ظاہر نہیں ہو سکتا[1]،

ہمدانی کے علاوہ دوسرے ناقدوں کا بھی یہ خیال ہے کہ متقدم ادبا و شعراء نے، متاخرین کے لئے
کوئی موضوع باقی نہیں چھوڑا، اور معانی کا جو ذخیرہ ممکن ہے وہ ختم ہو چکا، کتاب العمدہ میں ابن رشیق نے
بھی یہی خیال ظاہر کیا ہے، لیکن یہ تصور غلط فہمی پر مبنی ہے، ہر دور میں زندگی اور زمانہ نئے معانی ساتھ لاتا
ہے اور خود فنکار کا ذہن معانی اختراع کرتا ہے، بہت سے الفاظ کے جو معنی جاہلیت میں تھے، وہ اسلام
میں نہ رہے، جو دور اموی میں تھے وہ عصر عباسی میں نہ رہے، بلکہ نئے معانی سامنے آئے، عام و فرسودہ
معانی ہی تھے۔

دوسرا مسئلہ سرقہ کا ہے جو اس مزعومہ تصور پر مبنی ہے، کہ متقدمین نے ہر قسم کے معانی استعمال
کر ڈالے، اور اب نئے معنی باقی نہ رہے، اس لئے عرب ناقدوں نے معانی کے سرقہ کو جائز قرار دیدیا
البتہ یہ شرط لگا دی کہ الفاظ کا قالب اپنا اور نیا ہو،

اس سلسلہ میں جاحظ کا نظریہ یہ ہے کہ معانی کا علم تو عالم جاہل شہری اور دیہاتی سب کو
ہوتا ہے، اصل حسن اس کے قالب میں ہوتا ہے، بعد میں ابو ہلال عسکری نے اس نظریہ کو بنیاد بنا کر
لکھا ہے کہ چونکہ معانی کا علم تمام انسانوں میں مشترک ہوتا ہے، اور ہر شخص ان کو جانتا ہے اس لئے

---

[1] آداب الرسائل ص ۶-۷،

اسی میں سرقہ کا سوال نہیں، سرقہ صرف قالب میں ممکن ہے، اس لئے کہ الفاظ پہ قدرت اور زبان
پر عبور کے بغیر کوئی شخص نیا قالب نہیں پیش کر سکتا، ابو ہلال عسکری مہارتِ زبان کا مظہر عبارت آرائی
کو قرار دیتے ہیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک غلط نظریہ بہت سے غلط نظریات کو جنم دیتا ہے،
ہمدانی زبان کا کمال اس میں تصور کرتے ہیں کہ الفاظ و معانی میں مکمل ہم آہنگی ہو، اور وہ ایک
دوسرے کی زینت کا باعث ہوں، ان کے نزدیک اصل قوت اس وقت پیدا ہوتی ہے، جب ادیب
میں نظری صلاحیت ہو، اور اس صلاحیت کے ساتھ ادبی علوم پر پوری دسترس ہو، اسی وقت وہ
اعلیٰ درجہ کا ادیب بن سکتا ہے[1]،

نثر نگاری کا فن ان کے نزدیک نہایت معزز و محترم ہے وہ لکھتا ہے کہ تمام صنعتوں میں سب
زیادہ صنعت کتابت ہے جو انسان کو اعلیٰ مراتب تک پہنچاتی ہے، بعض لوگ اسی کے سہارے خلیفہ تک
بن گئے اور کتنوں کے ہاتھ میں اس کے ذریعہ ملک اور قوم کی زمام آگئی[2]،

ہمدانی کا نظریہ اس دور میں بھی صحیح تھا، مگر آج جدید دور میں قلم، عزت و عظمت کا ایک اہم ذریعہ ہے، اور
زبان و ادب کے میدان میں حیات جاودانی کا باعث ہے،

ادبا میں بعض عمداً مشکل الفاظ اور عوام کی زبان سے الگ زبان میں اپنے خیالات ظاہر کرتے ہیں
اور سمجھتے ہیں کہ انھوں نے عوام سے اپنے کو ممتاز بنالیا، اور ان سے بلند ہو گئے، لیکن ہمدانی کہتے
ہیں کہ ایسی زبان سے گونگا پن بہتر ہے[3]

ایک طرف وہ عوام سے الگ تھلگ رہنے اور ان کی زبان سے اجتناب کو صحیح تصور
نہیں کرتے، اور دوسری طرف ادب میں سوقیانہ الفاظ کے استعمال کو غیر معیاری قرار دیتے ہیں[4]
یعنی زبان عوام کی فہم سے بالاتر نہ ہونی چاہئے، مگر ادبی حیثیت سے اتنی گری بھی نہ چاہئے، کہ

---

[1] آداب الرسائل ص ۸، [2] ایضاً ص ۵-۶، [3] ایضاً ص ۳، [4] ایضاً ص ۴۔

وہ سوقیانہ ہو جائے،

نثر نگاری کے بارے میں یہ خیالات اس دور کے لحاظ سے قابلِ قدر ہیں، اس طرز کی تنقیدی کتابوں میں غیر معمولی اہمیت ان کے مقدمہ کو حاصل ہوتی ہے، چنانچہ ابن سلام کی طبقات الشعراء ابن قتیبہ کی الشعر والشعراء، ادب الکاتب اور ہمدانی کے آداب الرسائل کے مقدمات میں درحقیقت تنقید کی روح پوشیدہ ہے، اگر مذکورہ کتابوں سے ان کے مقدمے الگ کر دیئے جائیں تو ان کی تنقیدی عظمت باقی نہ رہ جائے،

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ

کا

مترجمہ و محشی قرآن مجید

اس مترجم قرآن پاک کا ایک شاندار اڈیشن ۳۰+۲۲ تقطیع پر آفسٹ مشین پر طبع ہونا شروع ہو گیا ہے، اور ۱۵ اکتوبر تک انشاء اللہ مکمل ہو جائیگا جس کا ہدیہ قسم اول غیر مجلد مبلغ عہ۲ ر، اور قسم دوم غیر مجلد عہ۱۲ ہے،

جلد بندی کی اجرت مستزاد ہوگی، جو حسب ذیل ہے، ریگزین ۶ر، ہاف چرمی بیہ ر، فل چرمی صہ ر

شائقین حضرات حسب خواہش صہ پیشگی بھیج کر اپنا آرڈر بک کرا لیں،

منیجر مدینہ بک ایجنسی بجنور۔ یو۔ پی

ادبیات

تضمین بر کلام اقبالؒ

از جناب نثار الرحمٰن صاحب نثار

افکار پہ چھاتا ہے جب رنگِ مسلمانی
کردار میں آتی ہے تابانیٔ لافانی
دانش کی تجلی بھی ہے رحمتِ یزدانی
"اک دانشِ نورانی اک دانشِ برہانی
ہے دانشِ برہانی حیرت کی فراوانی"

دراصل میری ہستی ہے رقصِ شرر جیسی
اس پہ یہ جگر کاوی، رنجوری و دلسوزی
کس سے میں کہوں اپنی یہ شدت مجبوری
"اس پیکرِ خاکی میں اک شے ہے سو وہ تیری
میرے لئے مشکل ہے اس شے کی نگہبانی"

محدود تھی لے میری بس اپنے ہی یاروں تک
کچھ سینہ فگاروں تک کچھ درد کے ماروں تک
پھر جھوم کے یہ نکلی محفل سے دیاروں تک

"اب کیا جو فغاں میری پہنچی ہے ستاروں تک
تو نے ہی سکھائی تھی مجھ کو یہ غزلخوانی"

شر فطرتِ بشری میں ہے جز کی طرح شامل
انساں تو ازل ہی سے تخریب کا ہے قائل
پھر تیری مشیت ہے تخلیق پہ کیوں مائل

"ہے نقش اگر باطل تکرار سے کیا حاصل
کیا تجھ کو خوش آتی ہے آدم کی یہ ارزانی"

ہیں آرزوئیں کتنی اک دل میں خدا جانے
بت کتنے تراشے ہیں جینے کی تمنا نے
یہ امرِ حقیقت ہے تو مانے یا نہ مانے

"تیرے بھی صنم خانے میرے بھی صنم خانے
دونوں کے صنم خاکی دونوں کے صنم فانی"

غزل

از جناب قمر سنبھلی، دہلی

گلوں میں حسن شگوفوں میں تازگی نہ رہی　چمن میں ہائے وہ پہلی سی دلکشی نہ رہی

وہ ربط عشق و محبت میں پختگی نہ رہی　جہاں میں آج رہ و رسم دوستی نہ رہی

ہمارے دم سے تری انجمن میں رونق تھی　ہم اٹھ گئے تو وہ دلچسپ زندگی نہ رہی

بھری بہار میں گلچیں نے وہ ستم توڑے　چمن میں آج شگفتہ کوئی کلی نہ رہی

ہمارا جذبِ محبت بھی کارگر نکلا　نگاہِ دوست میں پہلی سی برہمی نہ رہی

سنبھل سنبھل کے مرے دوستو چمن میں چلو　یہ خوشگوار فضا کل رہی رہی نہ رہی

چنی تھی شاخ جو ترتیبِ آشیاں کے لئے　مرا نصیب! کہ وہ شاخ بھی ہری نہ رہی

تری نگاہِ شرر بار کی ہو عمر دراز　کہ دل کی اب مرے پہلو میں خاک بھی نہ رہی

تمہارے ساتھ ہی رنگینیاں تھیں دنیا کی　تمہارے بعد کسی شے میں دلکشی نہ رہی

یہ سب تمہاری حسین یاد کا تصرف ہے　کہ خانۂ دلِ پُرغم میں تیرگی نہ رہی

قمرؔ وہ جب بھی کبھی انجمن سے اٹھ کے گئے
فلک پہ چاند ستاروں میں روشنی نہ رہی

غزل

از جناب نعیم احمد عزیزؔ بنارسی

کیا کام تو نے نرگسِ مستانہ کر دیا　کی وہ نظر کہ حاصلِ میخانہ کر دیا

جو چاہا تو نے جلوۂ جانانہ کر دیا　کعبہ بنا دیا کبھی بت خانہ کر دیا

جانِ سحر کی اک نگہِ التفات نے　صحنِ چمن سا میرا سیہ خانہ کر دیا

کیا چیز ہے جمالِ محبت بھی ہمنشیں　ناصح کو بھی جو حسن کا پروانہ کر دیا

پہنچا دیا کہاں یہ مجھے ذوقِ عشق نے　تیرے سوا ہر اک سے بیگانہ کر دیا

ان کی نگاہِ ناز کی نیرنگیاں نہ پوچھ　دل کو کبھی چمن کبھی ویرانہ کر دیا

وہ بارگاہِ ناز کہاں اور میں کہاں　کیا کام تو نے ہمتِ مردانہ کر دیا

وہ پیکرِ جمال جو آیا نگاہ میں　ہر ہر نظر نے سجدۂ شکرانہ کر دیا

ابھی رہی یہ عشق کی سوداگری عزیزؔ
دل کا نگاہِ یار سے بیعانہ کر دیا

غزل

از جناب محسن رضا صاحب جونپوری

اللہ اللہ رے کیا مشربِ رندانہ ہے — دونوں عالم لئے اک لغزشِ مستانہ ہے

شمع سی شمع نہ پروانہ سا پروانہ ہے — عشق کا سوز حقیقت ہے کہ افسانہ ہے

چشم ساقی کا عطیہ ہے کہ رندوں کا خلوص — جس طرف دیکھئے میخانہ ہی میخانہ ہے

شرط ہے عشق کے اک سجدہ کی تکمیل یہاں — یہ کسے ہوش کہ کعبہ ہے کہ بتخانہ ہے

شمع گے گرد سہی شمع کی لو پہ نہ سہی — بڑھ کے پروانہ سے خاکسترِ پروانہ ہے

نورافشاں نظر آتی ہے ہر اک راہِ گذر — کہکشاں ہے کہ فروغ خطِ پیمانہ ہے

ہوتی ہے بارش انوارِ دو عالم اس پر — رازِ کونین کا محرم دلِ دیوانہ ہے

جب سے آئے ہیں قدم ہم جگر افگاروں کے — دشت بھی دشت ہے ویرانہ بھی ویرانہ ہے

میری رودادِ وفا جس میں نہ شامل ہو رضا

وہ حکایت ہے کوئی وہ کوئی افسانہ ہے

کلیاتِ شبلی اردو

مثنوی، قصائد کے علاوہ مولانا کی وہ تمام اخلاقی، سیاسی، مذہبی اور تاریخی نظمیں جو کانپور، ٹرکی، طرابلس، بلقان، مسلم لیگ، مسلم یونیورسٹی وغیرہ کے متعلق لکھی گئی ہیں اس میں اکٹھا کر دی گئی ہیں، قیمت عہ

"منیجر"

باب التقریظ والانتقاد

نزہۃ الخواطر وبہجۃ المسامع والنواظر

(حصہ ہشتم)

مصنفہ مولانا حکیم سید عبد الحی صاحب مرحوم تقطیع بڑی ضخامت ۴۲۹ صفحات کاغذ اعلیٰ اور خوبصورت ٹائپ میں دائرۃ المعارف حیدرآباد سے شائع ہوئی ہے، قیمت تحریر نہیں،

ہندوستان صدیوں تک اسلامی تہذیب و ثقافت کا مرکز رہ چکا ہے، اس کی ثروت اور یہاں کے مسلمان سلاطین کی علم دوستی علماء نوازی اور ہنر پروری سے دنیائے اسلام خصوصاً وسط ایشیا کے بہت سے علمی خانوادے، علماء و مشائخ اور مختلف اصناف کے اصحاب علم و کمال ہندوستان میں جمع ہو گئے تھے، اور اس کے پایۂ تخت رشک بغداد و قرطبہ اور شیراز و اصفہان بن گئے تھے، خود ہندوستان میں ایسے ایسے علماء اور اہل کمال پیدا ہوئے، جو ائمہ اسلام کے ہم پایہ تھے، اور ان کی علمی فضیلت کا لوہا دنیائے اسلام کے علماء تک مانتے تھے، ان کے حالات اس عہد کی تاریخوں میں ملتے ہیں، فارسی اور اردو میں خاص علماء کے حالات میں بھی بعض کتابیں لکھی گئیں لیکن وہ بہت مختصر اور تشنہ ہیں، ان میں سب قابل ذکر علماء کا احاطہ نہیں ہے، دوسری بڑی کمی یہ ہے کہ عرب دنیا ان سے استفادہ نہیں کر سکتی، اس لئے ان چند نامور علماء کے سوا جنھوں نے عربی میں کتابیں لکھیں، یا جن کا عرب دنیا سے تعلق رہا، عام علماء سے وہ ناواقف ہیں اور عربی کی تراجم کی کتابوں میں بھی ان کا ذکر بہت کم ملتا ہے اس لئے عربی میں ان کے حالات لکھنے کی

بڑی ضرورت تھی، اس ضرورت کو مولانا حکیم سید عبد الحئی صاحب سابق ناظم ندوۃ العلماء مرحوم نے پورا کیا، اور "نزہۃ الخواطر و بہجۃ المسامع والنواظر" کے نام سے آٹھ ضخیم جلدوں میں ایک کتاب لکھی اس کے سات حصے اس سے پہلے دائرۃ المعارف حیدرآباد سے شائع ہو چکے ہیں، آٹھواں حصہ ابھی حال میں شائع ہوا ہے، یہ چودہویں صدی کے ۵۰۵ علماء، اور اصحاب علم و کمال کے حالات پر مشتمل ہے، مصنف کا انتقال ۱۳۴۱ھ میں ہو گیا تھا، اس لئے اس حصہ میں صرف ان علماء کے حالات ہیں جو ان کے زمانہ میں شہرت حاصل کر چکے تھے یا جن کی شہرت کا آغاز تھا اور بعد میں شہرت حاصل کی انکے حالات تشنہ تھے، بعد کے حالات مصنف کے خلف الصدق مولانا سید ابو الحسن علی نے بریکٹ میں بڑھا دیے ہیں، جن لوگوں نے مصنف کے بعد شہرت حاصل کی، ان کے حالات اس میں نہیں ہیں، ان کی تعداد اتنی ہے کہ اس کے لئے ایک مستقل جلد کی ضرورت تھی، نزہۃ الخواطر ہر حیثیت سے جامع اور معیاری کتاب اور اس کا درجہ تراجم کی قدیم عربی کتابوں سے کسی حیثیت سے کم نہیں ہے، زبان نہایت شستہ و رفتہ عربی انشا کا نمونہ ہے، ہندوستان مسلمانوں کی علمی تاریخ کا کوئی مورخ اس سے بے نیاز نہیں ہو سکتا، اس سے اس کی پوری تاریخ سامنے آجاتی ہے، تراجم میں ایک بڑا مسئلہ سنین کا ہوتا ہے، نزہۃ الخواطر میں اس کا خاص اہتمام کیا گیا ہے، کتاب کے شروع میں مولانا سید ابو الحسن علی کے قلم سے ایک مبسوط مقدمہ ہے، جو بجائے خود ہندوستانی مسلمانوں کی علمی تاریخ پر مختصر تبصرہ ہے،

"م"

نوائے عصر

جناب یحییٰ اعظمی کا دوسرا مجموعہ کلام ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کے پیش لفظ اور مولانا شاہ معین الدین ندوی اڈیٹر معارف کے تعارف کے ساتھ — قیمت ۵-۷ ر

"منیجر"

مطبوعات جدیدہ

اسلامی علوم و فنون ہندوستان میں — از مولانا حکیم سید عبد الحئی مرحوم، مترجمہ مولانا ابو العرفان ندوی
تقطیع کلاں صفحات ۲۸۴ قیمت [illegible] مرتبہ دار المصنفین اعظم گڈھ،

مولانا حکیم سید عبد الحئی مرحوم سابق ناظم ندوۃ العلماء کی نظر ہندوستان کے اسلامی عہد خصوصاً اس کی تاریخ پر بڑی گہری اور وسیع تھی، انھوں نے ان سے متعلق تنہا ایسے کام انجام دیئے ہیں، جن کو ایک پوری جماعت اور مستقل سوسائٹیاں انجام دیتی ہیں، زیر نظر کتاب بھی اسی نوعیت کی ہے، اس میں انھوں نے الفہرست اور کشف الظنون وغیرہ کے طرز پر گذشتہ ہزار سال کے ہندوستانی علماء و مصنفین کی تصانیف کی فہرست مرتب کی ہے، جو چار ابواب اور متعدد فصول پر مشتمل ہے، پہلے باب میں علوم آلیہ (نحو و صرف، لغت ادب اور تاریخ و سیر وغیرہ، دوسرے میں دینی علوم فقہ، حدیث، تفسیر، تصوف ادعیہ و اذکار اور کلام و عقائد کی، اور تیسرے میں عقلی علوم، جدل و مناظرہ، منطق و فلسفہ، ریاضی و ہیئت، اخلاق و طب و موسیقی وغیرہ کی عربی فارسی اور اردو کتابوں کی فہرست اور انکے مصنفین کے ناموں کا ذکر ہے، آخری باب میں ہندوستان کے اردو فارسی، اور ہندی کے شعراء اور ان کی شاعری کا اجمالی تذکرہ ہے، شروع میں ہندوستان کے قدیم نصاب درس کا مکمل خاکہ اور اس میں عہد بعہد تبدیلیوں پر تبصرہ ہے، ہر فن کے شروع میں اسکی تعریف، مختصر تاریخ اور غرض و غایت بھی بیان کی ہے، اور اس کے متعلق غیر ہندوستانی علماء کی اہمات کتب کا بھی ذکر کیا ہے، بعض کتابوں کے متعلق مختصر معلومات بھی دیدئے ہیں، اس اعتبار سے یہ اسلامی علوم و فنون اور ان کی کتابوں کی فہرست بھی ہے اور ہندوستانی مسلمانوں کی گذشتہ ہزار سالہ علمی و تعلیمی اور ذہنی و فکری

تاریخ بھی ہے، مصنف کی مشہور تصنیف نزہۃ الخواطر کی طرح یہ کتاب بھی عربی زبان میں تھی اور دس بارہ سال قبل مجمع العلمی دمشق نے اسکو بڑے اہتمام سے شائع کیا تھا، اب ندوہ کے لائق استاذ مولانا ابو العرفان ندوی نے اس کا سلیس و شگفتہ اردو ترجمہ کیا ہے، شروع میں مصنف کے فاضل و نامور فرزند مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نے ان کے حالات و سوانح اور علمی کمالات و خدمات تحریر کئے ہیں، اگر اردو ترجمہ کے ساتھ چند چیزوں کی جانب توجہ کی گئی ہوتی تو یہ کتاب اور جامع اور مفید ہو جاتی، مثلاً مصنف کے بعد مختلف فنون میں جن کتابوں کا اضافہ ہوا ہے، ان سب کا نہ سہی صرف امہات کتب کا حاشیہ یا ضمیمہ میں ذکر ہو جاتا اور مصنف نے جن مصنفین کے سنین وفات نہیں لکھے ہیں اور وہ مراجعت سے معلوم کئے جا سکتے تھے ان کو تحریر کر دیا جاتا، فنون کی طرح زبانوں کے لحاظ سے بھی فصلیں اور عنوانات قائم کئے جاتے، لیکن ان چیزوں سے کتاب کی قدر و قیمت میں کوئی فرق نہیں آتا، اور ہندوستانی مسلمانوں کی علمی تاریخ کا کوئی مورخ اس سے بے نیاز ہو سکتا ہے، اس کے ترجمہ سے اردو کے علمی ذخیرہ میں ایک بیش قیمت اور معلومات افزا کتاب کا اضافہ ہوا ہے،

متاعِ فقیر مرتبہ جناب عابد رضا صاحب بیدار، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ صفحات ۰۰، قیمت عہ پتہ رامپور انسٹیٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز ۱۸۰۶ دہلی ۶

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم کی وفات کے بعد اُن پر بکثرت مضامین اور بعض مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں، یہ نئی کتاب مشہور صحافی اور صاحبِ قلم جناب عابد رضا بیدار نے لکھی ہے، یہ دراصل بڑی حد تک ڈاکٹر صاحب کی خود نوشت سوانح عمری ہے، جس کو بیدار صاحب نے نئی ترتیب اور اپنے دلچسپ اندازِ تحریر سے بہت پُر لطف بنا دیا ہے، شروع میں ڈاکٹر صاحب کے خود نوشت حالات و سوانح ہیں، پھر مرتب نے ان کی شخصیت و افکار کو کچھ ان کی اور کچھ اپنی زبانی تحریر کیا ہے، ایک حصہ میں ڈاکٹر صاحب کی تحریروں، تقریروں اور خطوط وغیرہ کے ایسے اقتباسات نقل کئے گئے ہیں، جن سے ان کی

شخصیت اور اس کی تعمیر و تشکیل کے عناصر پر روشنی پڑتی ہے، اس حصہ میں ہندوستانی مسلمانوں، جامعہ ملیہ اور مسلم یونیورسٹی وغیرہ سے متعلق حالات اور خطبے خاص طور پر قابلِ مطالعہ ہیں، آخر میں جمیل احمد قریشی صاحب کی مرتب کردہ ببلوگرافی ہے، اس میں فن وار مختلف عنوانات کے ماتحت ذاکر صاحب کی تصنیفات، تقریروں، مکاتیب، تقریظوں، اور دیباچوں وغیرہ کا مکمل انڈکس دیا گیا ہے، اس کتاب کا انتساب ڈاکٹر سید عابد حسین کے نام بالکل بجا کیا گیا ہے، لیکن ان کے بارہ میں جو کچھ خیالات ظاہر کئے گئے ہیں، وہ مبالغہ سے خالی نہیں، لائق مرتب کو ایک مستقل باب میں ان تحریروں اور مضامین کا بھی ذکر کر دینا چاہئے تھا جو دوسرے اہلِ قلم نے ڈاکٹر صاحب پر لکھے ہیں، مرتب کے بعض تجزیوں اور نتائج میں بھی خامی ہے، مثلاً ایثار و قربانی وغیرہ کی اہمیت سے انکار، پونے دو سو صفحات کی کتاب کی تین روپے قیمت بہت زیادہ ہے، ان چیزوں سے قطع نظر اس سے ڈاکٹر صاحب کی سیرت و سوانح، شخصیت و افکار اور کارناموں کا مرقع بھی بڑی حد تک سامنے آجاتا ہے اور دلچسپ بھی ہے،

روضات مترجمہ جناب مولوی ثناء اللہ صاحب ندوی، تقطیع متوسط، صفحات ۱۳۲، کاغذ و کتابت و طباعت بہتر، قیمت ۲ (۱) پتہ پاک اکیڈمی ۱۴۱ وحید آباد کراچی ۱۸ (۲) کتب خانہ انجمن ترقی اردو، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی ۶،

یہ حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی کی جانب منسوب ایک فارسی رسالہ کا ترجمہ ہے، اس کا موضوع شریعت و طریقت میں تطبیق اور ان کے باہمی تعلق کی وضاحت ہے، مصنف نے دونوں کی حقیقت پر موثر اسلوب میں مفید بحث کی ہے، اور دنیا کی حقارت و بے ثباتی، عشق و اطاعتِ الٰہی اور اتباعِ سنت کی اہمیت اور وحدت الوجود کا بھی ذکر کیا ہے، لیکن بعض ضعیف حدیثوں سے بھی استدلال کیا ہے، ادارہ تحقیق و تصنیف کراچی نے رسالہ کا اصل فارسی متن مع اردو ترجمہ شائع کیا ہے، لائق مترجم نے آخر میں قرآنی آیات کی علٰحدہ تخریج کی ہے، اگر وہ احادیث کی تخریج اور بعض دقیق مطالب کی وضاحت کے لئے

مختصر حواشی بھی قلمبند کر دیتے تو اس کا افادہ بڑھ جاتا، گو حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی کی تصنیفات کی فہرست میں اس رسالہ کا نام نہیں ملتا، لیکن فاضل دیباچہ نگار مفتی انتظام اللہ شہابی صاحب نے انکو پورے یقین کے ساتھ ان کی تصنیف قرار دیا ہے، یہ رسالہ مفید دینی فوائد پر مشتمل اور علماء و اصحاب طریقت کے لئے یکساں دلچسپ اور لائق مطالعہ ہے،

معارف التجوید، مرتبہ جناب مولانا قاری محمد حبیب اللہ صاحب تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۲۸۰ مجلد قیمت درج نہیں پتہ ۱۔ مسجد القرآن فاروقی مسجد، میری ویدر ٹاور کراچی ۲

(۲) اعجاز کالونی، بیسلہ ہاؤس، لارنس روڈ کراچی ۵،

مولانا قاری محمد حبیب اللہ صدر مدرس مدرسہ تجوید القرآن فاروقی مسجد کراچی نے فن تجوید پر یہ رسالہ لکھا ہے، جو اس فن کے متعلق ضروری اور مفید معلومات پر مشتمل ہے، اس میں علم تجوید، اوقاف کے قاعدے، مخارج کے آداب، حروف کی مفصل صفات اور رسم خط کے مسائل بڑی خوبی سے لکھے گئے ہیں، بعض مباحث کے ضمن میں فقہی مسائل بھی بیان کئے گئے ہیں، یہ فنی کتاب ہے، اس لئے مصنف نے اس کو عام فہم بنانے کے لئے آسان انداز، دلچسپ پیرایہ اور سوال و جواب کے طرز میں لکھا ہے، اور مصطلحات فن کی تشریح اور بعض مشکل مقامات کو جدولوں کے ذریعہ واضح کر دیا ہے، اس لئے طلبہ فن کے علاوہ عام قرآن خوانوں کے لئے بھی ایک حد تک اس سے استفادہ آسان ہو گیا ہے،

مضامین ہفت رنگ، مرتبہ ڈاکٹر آفتاب اختر صاحب، تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت بہتر صفحات ۲۰۰ قیمت ۱۲ روپے پتہ:۔ نسیم بک ڈپو لاٹوش روڈ، لکھنؤ،

ڈاکٹر آفتاب اختر ہونہار اہل قلم ہیں، ان کے ادبی و تنقیدی مضامین مختلف ادبی رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں، اب انھوں نے اپنے مضامین کا مجموعہ شائع کیا ہے، اس میں اکثر مضامین اردو شاعری کے اور چار مضامین فارسی شاعری کے متعلق ہیں یہ سب مضامین محنت سے لکھے گئے ہیں لیکن مختصر ہیں، اور موضوع کے تمام پہلوؤں کو محیط نہیں ہیں، وہ غیر ادبی نوعیت کے مضامین

بھی درج ہیں، ایک میں میکاولی کے مشہور نظریہ یعنی سیاست میں مذہب و اخلاق کے دخل نہ دینے کی وضاحت کی گئی ہے، اور اس کے بارہ میں شدید رد عمل کا ذکر کیا گیا ہے، اور دوسرے میں دنیا کے عام ملکوں خصوصاً بڑی طاقتوں کے دعوائے امن پسندی کی اصل حقیقت ظاہر کرنے کے بعد گاندھی جی کے فلسفۂ عدم تشدد میں امن عالم کا راز مضمر بتایا گیا ہے، اور اس ضمن میں ہندوستان کی امن و صلح پسند پالیسی کا بھی ذکر ہے، لیکن یہ تحریر ہندوستان کے موجودہ سیاسی انقلاب سے ایک حد تک متاثر معلوم ہوتی ہے، ورنہ ملک میں جو اندرونی خلفشار اور بربریت پائی جاتی ہے، اس کا عدم تشدد اور امن پسندی سے کیا تعلق؟ شروع کے ایک مضمون میں مصنف نے اپنے ادبی عقائد و نظریات واضح کئے ہیں، جو بڑی حد تک متوازن ہیں،

اردو شاعری میں ہندوستانی روح، مرتبہ جناب زرینہ ثانی صاحبہ، تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۱۱۲، قیمت ۶ روپے، پتہ نسیم بک ڈپو، لاٹوش روڈ، لکھنؤ،

یہ ایک صاحب قلم خاتون کے ادبی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے، مصنفہ نے اس میں اردو کے بعض قدیم و جدید شعراء کے کلام کے خاص اصناف کے خصوصیات دکھائے ہیں، ایک مضمون میں موجودہ دور کی عزائیہ شاعری کو مرثیہ کا نیا موڑ قرار دیا ہے، اور اس کے محاسن پر روشنی ڈالی ہے، ایک مضمون "اردو شاعری میں ہندوستانی روح" کے زیر عنوان اردو شاعری کی سیکولر روایات، رواداری اور وسیع المشربی وغیرہ کو دکھایا گیا ہے، یہ مضمون اگرچہ سب میں اہم ہے، لیکن مختصر ہے، ان چیزوں کو تفصیل سے دکھانے کی ضرورت تھی، اس سے قطع نظر یہ مجموعہ دلچسپ اور نوجوان ادیبہ کی خوش ذوقی کا ثبوت ہے، عرصہ ہوا مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی ایڈیٹر معارف نے "اردو شاعری میں ہندو کلچر اور ہندوستان کے طبعی اور جغرافی اثرات" کے عنوان سے ایک مفصل مقالہ تحریر کیا تھا، جو ان کے ادبی مضامین

کے مجموعہ "ادبی نقوش" میں شامل ہے۔

میگزین فضل الرحمن — مرتبہ ڈاکٹر محمد شکیل احمد صدیقی، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت و
اسلامیہ انٹر کالج بریلی — طباعت دیدہ زیب، سرورق، صفحات ۱۴۱، قیمت تحریر نہیں،
پتہ: فضل الرحمن اسلامیہ انٹر کالج، بریلی۔

غالب صدی کے موقع پر مختلف کالجوں نے بھی غالب نمبر نکالے ہیں یہ نمبر بریلی کے اسلامیہ انٹر کالج کا ہے، جو ترتیب، مضامین کے تنوع اور معیار کے اعتبار سے بعض رسالوں کے غالب نمبروں سے بڑھا ہوا ہے، کالج کے طلبہ و اساتذہ کے علاوہ بیرونی اصحاب قلم میں مولانا عرشی ضیاء احمد صاحب بدایونی اور خواجہ احمد صاحب فاروقی اور متعدد متعارف و غیر متعارف اہل قلم کے مضامین ہیں، ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب کا مضمون محققانہ و معلومات افزا، اور احمد جمال پاشا کا مزاحیہ مضمون بھی دلچسپ ہے، بعض مضامین میں غالب کی مشکل پسندی اور غزل میں عدم تسلسل وغیرہ کا جواب دیا گیا ہے، نظم کا حصہ بھی خاصہ متنوع ہے، اس میں حالی کے عہد سے لیکر موجودہ دور کے شاعروں نے غالب کی عظمت کے اعتراف کے بارہ میں جو کچھ کہا ہے، اس کو نقل کیا گیا ہے، ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی غالب کے اشعار کا اودھی زبان میں ترجمہ کر رہے ہیں، اس نمبر میں بھی اشعار کا اودھی ترجمہ بھی شامل ہے، آخر میں ہندی میں بھی غالب پر چند مضامین ہیں، جا بجا غالب کے متفرق اقوال اور تحریریں بھی دی گئی ہیں، جو ادبی و لسانی حیثیت سے بصیرت افروز ہیں، غرض یہ نمبر محنت اور سلیقہ سے مرتب کیا گیا ہے، اور غالب پر نکلنے والے اچھے نمبروں میں شمار ہونے کے لائق ہے۔

"ض"

جلد ۱۰۶ ماہ رجب المرجب ۱۳۹۰ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۷۰ء عدد ۳

مضامین

عنوان	مضمون نگار	صفحات
شذرات	شاہ معین الدین احمد ندوی	۱۶۲-۱۶۴
مقالات		
تصوف اور اس کے مسائل	جناب ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ صاحب، ایم اے پی ایچ ڈی (لندن)، سابق پروفیسر عربی پنجاب یونیورسٹی، لاہور	۱۶۵-۱۸۴
بانی درس نظامی ملا نظام الدین فرنگی محلی	جناب مفتی محمد رضا انصاری صاحب فرنگی محلی، استاذ شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	۱۸۵-۲۰۷
حضرت عمرو بن احمر باہلی کا دیوان	جناب مولوی احمد خاں صاحب ایم اے، اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، کراچی	۲۰۸-۲۲۱
سید قادر میاں خوشتر احمد آبادی اور ان کا ایک مرثیہ	جناب محمد ایوب صاحب واقف ایم اے ریسرچ اسکالر، اسمٰعیل یوسف کالج جوگیشوری بمبئی	۲۲۲-۲۳۱
ادبیات		
رباعیات ترجمانی استاد غالب (بمناسبت تقریب جشن صد سالہ غالب)	جناب پروفیسر نکہت شاہجہانپوری	۲۳۲-۲۳۳
غزل	جناب رزم ردولوی	۲۳۳-۲۳۴
"	جناب پروفیسر افتخار احمد صاحب فخر دھول پوری ایم اے	۲۳۴-
مطبوعات جدیدہ	"ض"	۲۳۵-۲۴۰